khusro foundation

ترنگا آنچل

طہٰ نسیم

ترنگا آنچل

طہٰ نسیم

KHUSRO FOUNDATION
www.khusrofoundation.org

© All Rights Reserved to Khusro Foundation 2025

Tiranga Aanchal

Taha Nasim

ISBN: 978-81-989382-7-5

Rs. 150.00

نامِ کتاب : ترنگا آنچل
مصنف : طٰہٰ نسیم
صفحات : 64
سنہ اشاعت : 2025
تعداد : 500
قیمت : 150 روپے
ناشر : خسرو فاؤنڈیشن، ڈی 319، ڈیفنس کالونی، نئی دہلی

Printed by

Creative Star Publications
Okhla, New Delhi
Email: creativestar1122@gmail.com
Call: 8851148278, 9958380431

پیش لفظ

''ترنگا آنچل'' بچوں کی دلچسپی کے لیے لکھی گئی حقیقت پر مبنی کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں انسانی، اخلاقی، تہذیبی، رواداری اور حب الوطنی کے جذبات واحساسات کو اس خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ جو بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے ہی دلچسپی کا سبب بن سکے۔

کتاب کے مصنف طٰہٰ نسیم صاحب ایک کہنہ مشق ادیب وقلم کار ہیں جن کو ادبِ اطفال ودینی واخلاقی عنوانات پر لکھنے کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ موصوف اب تک 70 سے زائد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں جن میں سے کچھ بیسٹ سیلر بھی رہی ہیں۔

طٰہٰ نسیم صاحب کی شخصیت میں جس قدر تواضح، انکساری، سنجیدگی اور ایمانداری ہے وہی ان کی کہانیوں کے کردار میں بھی نظر آتا ہے۔ طٰہٰ نسیم کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات سے کہانی کا کردار بناتے ہیں۔ زبان وبیان کی سادگی کے ساتھ ادبی پہلوؤں کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ نسیم صاحب کا تعلق چونکہ پرانی دہلی کے ایک علمی گھرانے سے ہے اس لئے دہلی کی تہذیب وروایات وہاں کے گلی کوچوں میں واقع ہونے والے واقعات پر ان کی خاص نظر رہتی ہے۔

زیر نظر کتاب ''ترنگا آنچل'' اخلاقی، انسانی، رواداری، حب الوطنی اور ایمانداری پر

مشتمل کہانیوں کا مجموعہ ہے جو مصنف نے خاص طور سے خسرو فاؤنڈیشن کے لیے تیار کیا ہے۔ کتاب میں کئی کہانیاں ایسی ہیں جو قاری کو جذباتی کر سکتی ہیں۔

دورِ حاضر میں جہاں لوگ اپنے ماضی سے کٹتے و مشینی گرفت میں جاتے، اپنی تہذیبی، اخلاقی، رواداری کو فراموش کرتے جا رہے ہیں ایسے حالات میں ''ترنگا آنچل'' کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

طٰہٰ نسیم کی تحریروں کو پڑھ کر کسی اردو شاعر کا یہ شعر بے ساختہ ذہن میں آتا ہے:

وہی کہا ہے جو محسوس کر لیا ہے دوست
مری بیاض میں حوروں کے واقعات نہیں

خسرو فاؤنڈیشن چونکہ ایسے لٹریچر کو سامنے لانے کے لیے سرگرم ہے جس کی بنیاد اخلاقی رواداری، جذبہ حب الوطنی، انسان دوستی پر ہو اور ''ترنگا آنچل'' ہماری نئی نسلوں کی معلومات کے لیے اس سلسلے کی بہترین کڑی ثابت ہوگی۔ انشاءاللہ

ہم خسرو فاؤنڈیشن کی جانب سے نسیم صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے کم وقت میں اس کتاب کی تکمیل کی۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری دیگر مطبوعات کی طرح ''ترنگا آنچل'' کو بھی قارئین پسند فرمائیں گے۔

ڈاکٹر حفیظ الرحمن
کنوینر
خسرو فاؤنڈیشن

ترنگا آنچل

''امّی میں بھی ترنگا خریدوں گا۔'' سیف نے ماں سے پھر کہا۔ ''لیکن بیٹے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ آج کام بھی نہیں ہے، کہاں سے لاؤں۔'' ماسٹر صاحب نے سب بچوں سے گھر پر ترنگا لگانے کو کہا ہے۔ ''میں بھی لگاؤں گا۔'' ماں نے پلّو میں بندھے پیسے گنے تو صرف 20 روپئے تھے۔ انہیں پیسوں کا ماں کو آٹا خریدنا تھا۔ اس نے سوچا پانچ روپئے والا کاغذ کا جھنڈا دلوا دوں لیکن وہ بارش میں بھیگ کر خراب ہو جائے گا۔ ماں کا جواب سُن کر وہ رنجیدہ ہو گیا اور کھڑکی میں کھڑا ہو کر سڑک پر دیکھنے لگا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی اور سڑک نالا بنی ہوئی تھی۔ اس کی چھت سے بھی پانی ٹپک رہا تھا۔ سیف کی ماں سڑک کنارے بھٹے بیچتی تھی لیکن بارش میں سڑک پر بیٹھنا ناممکن تھا۔

وہ سیف کے والد کے گزر جانے کے بعد چھوٹے موٹے کام کر کے اپنا اور دو بچوں کا پیٹ پالتی تھی۔ لیکن سیف تو آزادی کا نشان ترنگا گھر پر پھیرا کر شہدائے آزادی کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا تھا۔ سیف نے ملک کی آزادی کے لئے ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر، بھگت سنگھ، اشفاق اللہ خان اور رام پرساد بسمل کی بہادری اور قربانیوں کے واقعات سنے تھے۔ انہیں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے وہ جھنڈا لگانا چاہتا تھا لیکن غربت کے

چلتے وہ ایک جھنڈا بھی نہیں خرید سکتا۔ ماں کو بھی بچے کے جذبے کا احترام تھا۔ وہ بے چاری مجبور تھی۔ دراصل پیٹ کی آگ ہر طرح کے جشن کو بھلا دیتی ہے۔ آزادی سے پہلے بھی غریب ایسا ہی تھا اور بعد میں بھی۔ اسے صرف زندہ رہنے کی جدوجہد کرنی تھی اور آج بھی جاری تھی۔ ماں کو کچھ خیال آیا اور اس نے پرانا صندوق اور گٹھریاں کھولیں اور کچھ تلاش کرنے لگی۔ اسے اپنے شوہر کے پیار کی نشانی ہرے نارنگی رنگ کا دوپٹا کاٹا، بیچ میں سفید پٹی جوڑی اور جھنڈا بنا لیا۔ ایک چھڑی میں اسے لگایا اور کھڑکی میں ٹانگ دیا۔ صبح سیف کی آنکھ کھلی تو کھڑکی میں ترنگا لہرا رہا تھا۔ ماں نے آنچل کو جھنڈے میں تبدیل کر دیا تھا۔ ترنگا آزادی اور ماں کی ممتا کا اظہار کر رہا تھا۔

مجاز لکھنوی کے شعر کے مطابق اس ماں نے وہی کیا:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

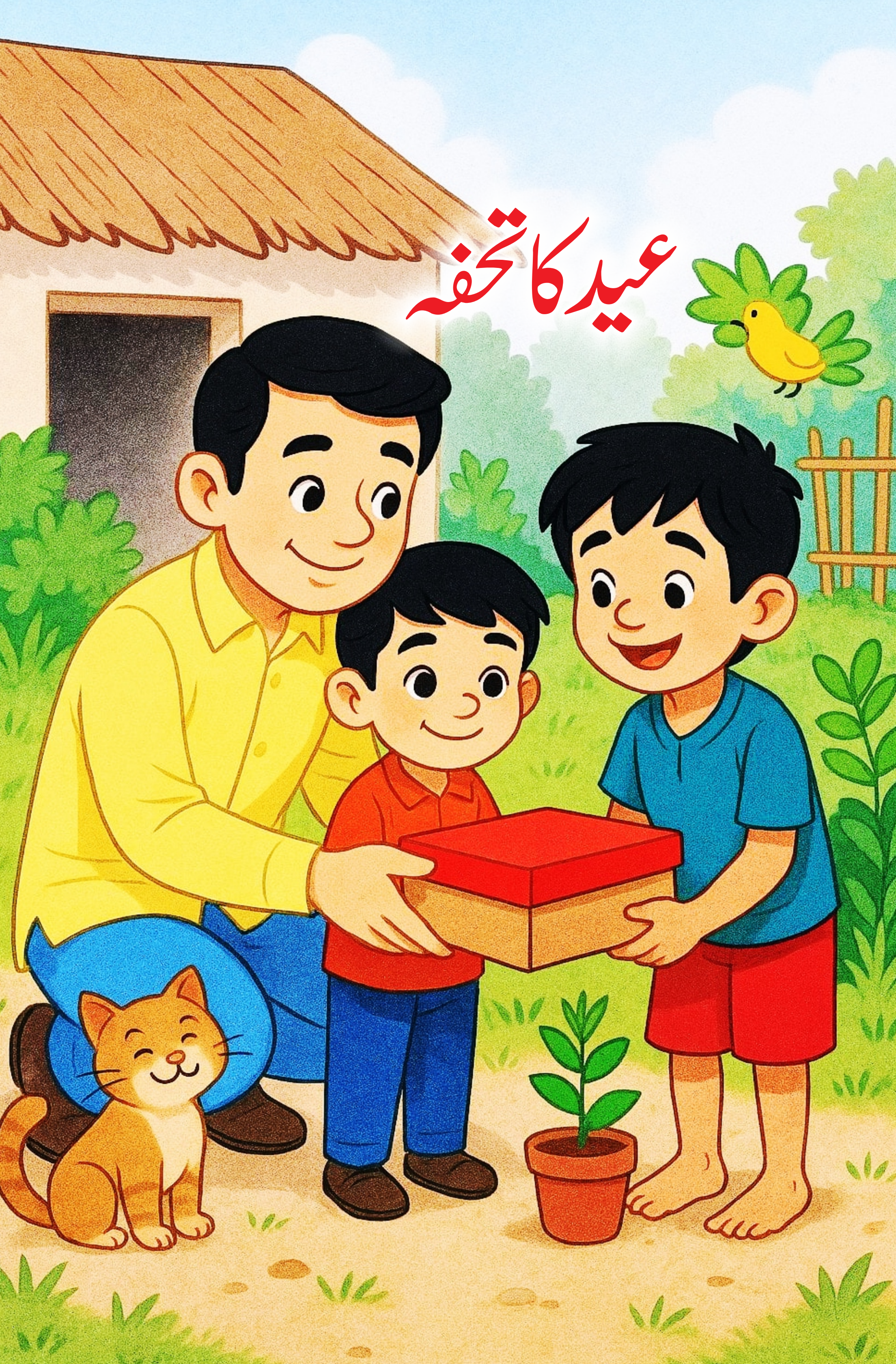
عید کا تحفہ

★

شامو نے نرم چمڑا سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ دیوالی سے پہلے اپنے بیٹے راجو کے لیے جوتے بنانا چاہتا تھا۔ شامو گھر پر ہی جوتے بناتا اور انہیں بازار میں بیچتا۔ اس کے بنائے جوتے مضبوط اور سستے ہوتے تھے۔ وہ ایک محنتی اور ایماندار آدمی تھا۔ اسے جتنے پیسے مل جاتے انہیں سے خوش ہو جاتا۔

راجو کا سب سے اچھا دوست سلیم تھا۔ سلیم اپنی امّی اور بھائی کے ساتھ راجو کے پڑوس میں رہتا تھا۔ دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے اور کھیلتے تھے۔ سلیم کے ابّا رکشہ چلاتے تھے۔ ایک سال پہلے سڑک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ سلیم کی امّی کپڑے سی کر اپنا گھر چلاتی تھی۔ سلیم پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔ وہ ہمیشہ اوّل آتا تھا۔

راجو اور سلیم ایک دوسرے کو بھائی کی طرح چاہتے تھے۔ سلیم کے پاس نہ تو اچھے کپڑے تھے اور نہ جوتے۔ اسکول سے جو جوتے اسے ملے تھے وہ جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ انہیں کی مرمّت کرا کر وہ پہنتا تھا۔

عید آنے والی تھی۔ سبھی عید کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بستی کے لوگ گھروں میں رنگ روغن کرا رہے تھے۔ عورتیں اور بچے نئے کپڑے اور جوتے خرید رہے تھے۔ لیکن سلیم

کے گھر ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی ماں سلائی کر کے جو کچھ کماتی وہ کھانے پینے اور گھر کی دوسری ضرورتوں پر خرچ ہو جاتا۔ کلاس کے بچے نئے کپڑوں اور جوتوں کی بات کرتے تو سلیم دکھی ہو جاتا۔ وہ سوچتا کہ کیا اس سال عید پر اس کے جوتے اور کپڑے نہیں آئیں گے۔ سلیم دکھی من سے بچوں کی باتیں سنتا۔ جب زیادہ دکھی ہوتا تو راجو کے ساتھ اپنا غم بانٹ لیتا۔ راجو اس کی بات سن کر خود بھی دکھی ہو جاتا۔ وہ سوچتا کہ وہ کیسے اپنے دوست کی مدد کرے۔ وہ خود غریب تھا اور چھوٹا بھی تھا۔ ایک دن اسے یاد آیا کہ اس کے والد نے اس کے جوتے بنانے کے لیے بہترین چمڑا خریدا ہوا ہے۔ وہ دیوالی پر اس کے لیے جوتے بنائیں گے۔ وہ اپنے والد کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ وہ اس چمڑے سے سلیم کے لئے جوتے بنا دیں۔ شامو نے اسے بتایا کہ ان کے اس پاس بس اتنا ہی چمڑا ہے۔ اگر سلیم کے لیے جوتے بنا دیے تو دیوالی پر راجو کے لیے جوتے نہیں بن پائیں گے۔ راجو نے کچھ سوچ کر شامو سے کہا، ”ٹھیک ہے۔ میں دیوالی پر نئے جوتے نہیں پہنوں گا۔ میں پرانے جوتوں سے کام چلا لوں گا۔ آپ سلیم کے لیے جوتے بنا دیں۔ وہ خوش ہوگا تو مجھے بھی خوشی ہوگی۔ ہم اس کی اتنی تو مدد کر ہی سکتے ہیں۔“

یہ سن کر راجو کے والد خاموش ہو گئے۔ سلیم اور راجو برابر کے تھے۔ ان کے پاؤں کا سائز بھی برابر تھا۔

اگلے دن شامو نے سلیم کے لیے جوتے بنانے شروع کر دیے۔ عید سے ایک دن پہلے انہوں نے جوتے ایک ڈبّے میں رکھے اور سلیم کو عید کی مبارکباد دینے اس کے گھر پہنچ گئے۔ شامو نے سلیم کے سر پر ہاتھ رکھ کر آشیرواد دیا اور ڈبّا دیتے ہوئے کہا، ”ہمارے جانے کے بعد ڈبّا کھولنا۔“

باپ بیٹا سلیم کے گھر سے نکلے تو بہت خوش تھے۔ انہوں نے سلیم کو عید کا ایسا تحفہ دیا تھا جس سے اس کے گھر میں بھی عید کی خوشیاں لوٹ آئی تھیں۔

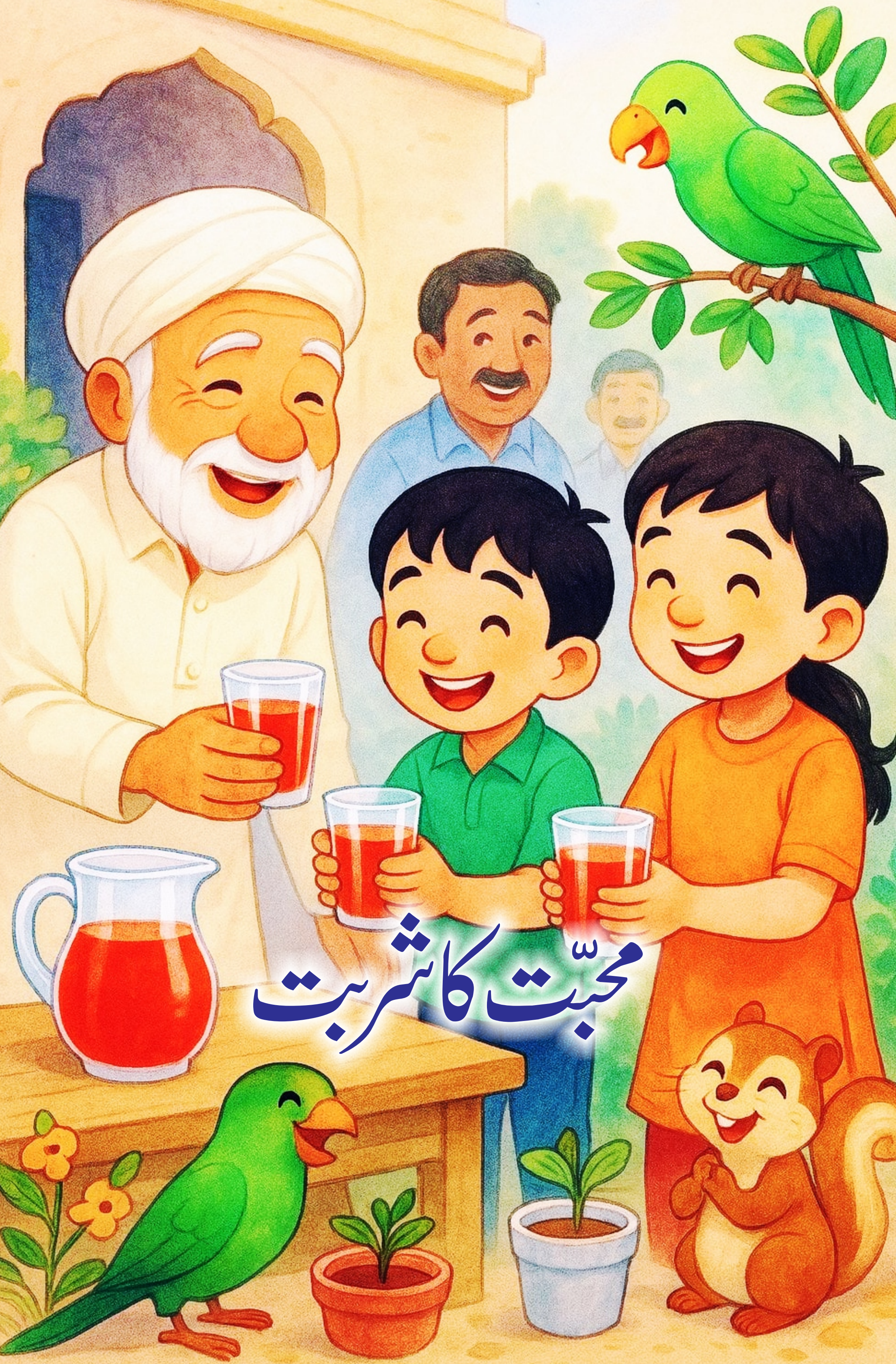
محبّت کا شربت

★

ان کا نام تو اسٹیفن تھا لیکن محلّے میں وہ ماسٹر جی کے نام سے مشہور تھے۔وہ ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر تھے۔اکیلے رہتے تھے۔نہ بیوی بچّے نہ بھائی بہن۔محلّے کے بچّے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے۔ماسٹر جی بہت کم پیسے لیتے تھے۔اگر کوئی غریب بچّہ آ گیا تو اسے مفت پڑھاتے تھے۔حالانکہ عیسائیوں کی بستی کے سب لوگ دوسرے علاقوں میں جا کر بس گئے تھے لیکن ماسٹر جی نے اپنا گھر نہیں چھوڑا تھا۔وہ اس جگہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ میں اِس گھر میں پیدا ہوا تھا اور یہیں مروں گا۔ماسٹر جی نے شادی کیوں نہیں کی اور ان کے رشتے دار کہاں تھے،کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس بار یومِ عاشورہ سخت گرمی میں آنے والا تھا۔اسکولوں کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔اس محلّے کے ایک بزرگ چچا رحمٰن ہر سال شربت کی سبیل لگایا کرتے تھے۔محرم سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا تو محلّے کے بچوں کو فکر ہوئی کہ سبیل کون لگائے گا۔چچا تو محرّم آنے سے پہلے ہی لوگوں سے چندہ لینے لگتے تھے۔کیونکہ وہ پرانے آدمی تھے۔سبھی ان کی عزت کرتے تھے اور خوشی خوشی شربت کی سبیل لگانے کے لیے چندہ دیتے تھے۔

اسلم،جیوتی اور عمران ماسٹر جی کے خاص شاگرد تھے۔ایک دن وہ ٹیوشن کے لیے آئے تو آپس میں شربت کی سبیل لگانے کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔بچوں کو سبیل پر

شربت پلانا بہت اچھا لگتا تھا۔محلّے کے بچے چچا کے ساتھ شربت بنواتے اورلوگوں کوشربت پلاتے۔رحمٰن چچا کے انتقال کے بعد لگتا تھا کہ سبیل نہیں لگے گی۔

ماسٹر جی بچوں کی باتیں سن رہے تھے۔وہ جانتے تھے کہ چچا رحمٰن برسوں سے سبیل لگا رہے تھےاور وہ خود بھی چندہ دیا کرتے تھے۔ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ بند ہونے کو تھا۔ہمارے تہوار اور میلے ٹھیلے صدیوں سے لوگوں کے میل ملاپ کا اہم ذریعہ رہے ہیں۔لوگ خوشی خوشی ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت کرتے ہیں۔ ماسٹر جی نہیں چاہتے تھے کہ یہ سلسلہ بند ہو۔انھوں نے بچوں سے کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں تمہاری سبیل لگے۔ دراصل ماسٹر جی کے پڑوسی اور شاگرد ہی ان کا خاندان تھے۔وہ اس روایت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔سبیل ان کے محلّے کی پہچان تھی۔

محرم کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ایک دن بچے پڑھنے آئے تو ماسٹر جی نے انہیں خوش خبری سنائی کہ اس بار بھی سبیل لگے گی۔ بچوں کو یقین نہیں ہوا کہ ماسٹر جی کیسے سبیل لگائیں گے۔ ماسٹر جی ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر سمجھ گئے کہ بچے ان کی بات کا یقین نہیں کررہے۔چھٹّی کے وقت وہ بچوں کو لالہ جی کی دکان پر لے گئےاور لالہ جی سے کہا کہ بچوں کو شربت بنانے کا سامان دکھادو۔لالہ جی نے دکان کے ایک حصے میں رکھی روح افزا کی بوتلیں،چینی او پستہ بادام دکھائے۔ یہ دیکھ کر بچے بہت خوش ہوئے۔یومِ عاشورہ پر سبیل اسی جگہ لگائی گئی جہاں برسوں سے لگتی آرہی تھی۔دودھ والے نے پچاس لیٹر دودھ پہنچا دیا۔ بچوں نے ماسٹر جی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر شربت بنایا۔محلّے کے سبھی دکانداروں نے ماسٹر جی کا نام سن کر سستا سامان دیا تھا۔ جب شربت تقسیم ہونے لگا تو بڑی تعداد میں بچے اور بڑے جمع ہو گئے۔کوئی بزرگ گھر سے ڈولچی لیے ہوئے آئے اور بولے! بھائی محبت کا شربت مجھے بھی دے دواور ان کی بات سُن کر سبھی ہنس دیے۔

آؤ مل کر پیڑ لگائیں

★

اسکول کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ سبھی بچّے گھروں پر تھے۔ حالانکہ اسکول سے ہوم ورک ملا تھا پھر بھی بچّے کچھ نیا کرنے کی سوچ رہے تھے۔ لیکن سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ ان کے محلّے میں نہ تو کوئی پارک تھا، نا ہی کوئی کمیونٹی سینٹر، جہاں جا کر بچّے کھیل سکیں یا کچھ سیکھ سکیں۔ فائز نے بچّوں سے کہا: ہمارے بھائی ندیم بہت سمجھ دار ہیں ان سے مشورہ کرتے ہیں کہ ہم چھٹّیوں میں ایسا کیا کریں جس سے ہمیں کچھ سیکھنے کا موقع ملے۔

بھائی ندیم ایک تاجر تھے اور سماجی کاموں میں آگے آگے رہتے تھے۔ وہ ایک پڑھے لکھے اور سمجھ دار انسان تھے۔ شام کو کچھ بچّے فائز کے ساتھ مل کر بھائی ندیم کے پاس گئے۔ انہوں نے ان سے مشورہ کیا کہ ہم چھٹیوں میں کیا کریں۔

بھائی ندیم نے کچھ سوچا اور بولے: ''بچوں جس سماج میں ہم رہتے ہیں ہمیں اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔''

بچّوں کے کچھ سمجھ نہیں آیا اور وہ منہ کھولے ان کی طرف تعجب سے دیکھنے لگے۔

بھائی ندیم سمجھ گئے کہ بچوں کو بات سمجھ نہیں آئی۔ انہوں نے کہا: ''جو لوگ ہمارے محلّے میں رہتے ہیں وہ کیا کہلاتے ہیں؟''

بچوں نے ایک ساتھ جواب دیا: ''پڑوسی۔''

ہم اور ہمارے آس پاس رہنے والے؛ یہ سمجھ لو ہماری بستی کے لوگ مل کر سماج بناتے ہیں۔ سماج کے لیے ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ یہ اچھا شہری ہونے کی نشانی ہے۔ تو بچوں ہم

چھٹیوں میں اگر پرانے ڈبّے، کنستر اور بوتلیں جمع کر کے ان میں پودے لگائیں تو کیسا رہے گا؟

بچوں نے کہا: ''بڑا مزہ آئے گا۔''

ندیم بھائی نے پوچھا: ''یہ بتاؤ کہ پیڑ پودے لگانے سے کیا کیا فائدے ہوتے ہیں؟''

بچوں نے ایک زبان ہوکر کہا: ''پودوں سے ہمیں آکسیجن ملتی ہے۔ یہ ہوا کی آلودگی ختم کرتے ہیں۔ ہریالی دیکھنے سے دل خوش ہوتا ہے۔''

بالکل! ندیم بھائی مسکرا کر بولے۔

ندیم بھائی کے ساتھ مل کر بچوں نے ایک دن اُن مقامات کی فہرست بنائی جہاں پودے لگانے تھے۔ ان جگہوں کو جا کر دیکھا جہاں لوگ کوڑا کرکٹ پھینک دیتے ہیں۔

ندیم بھائی نے بچوں کو پیڑ پودے لگانے اور صفائی کرنے کے طریقے بتائے۔ ان کے دوست بھی اس کام میں تعاون کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

بچوں نے اپنے گھروں اور دکانوں سے پرانے ڈبّے، کنستر اور پلاسٹک کی بوتلیں جمع کیں۔ مسجد کے امام صاحب نے بھی لوگوں سے بات کی کہ وہ بچوں کی مدد کریں۔ کسی نے پودے لاکر دیے تو کسی نے کھاد اور مٹّی کا انتظام کیا۔ بچوں نے ڈرائنگ شیٹس پر پودے بنائے اور صفائی کے بارے میں نعرے لکھے اور سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ پہلے تو لوگوں کو یہ سب بڑا عجیب لگا لیکن بچوں کا جذبہ دیکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ تھوڑے دن میں ہی محلّے میں ہر طرف صفائی اور ہریالی نظر آنے لگی۔

یہ دیکھ کر سمجھ دار لوگ بولے، ''اگر ہر کوئی اسی طرح اپنے علاقے کو صاف ستھرا بنانے اور پیڑ پودے لگانے میں دلچسپی لینے لگے تو ہر علاقہ گلزار بن جائے گا۔

گورا کوّا

اگر کسی کوّے کو گورا کہہ کر پکارا جائے تو آپ کو ہنسی آ جائے گی۔ کوّا تو کالا کلوٹا ہوتا ہے لیکن جس کوّے کی ہم بات کر رہے ہیں وہ تو حد سے زیادہ کالا ہے۔ اس کے باوجود منّی اس سے بہت پیار کرتی ہے۔ یہ بس منّی کی ہر بات سمجھتا ہے۔ بہت وفادار اور سمجھ دار کوّا ہے۔

سوال اٹھتا ہے کہ اس کا نام گورا کیسے پڑا؟

ہوا یوں کہ ایک دن منّی اپنے دوستوں اور بہن بھائیوں کے ساتھ باغ میں کھیل رہی تھی۔ بچّوں کو پیڑ کے نیچے کچھ پڑا ہوا نظر آیا۔ وہ جو کچھ بھی تھا حرکت کر رہا تھا۔ منّی آگے بڑھی اور اس نے غور سے دیکھا تو وہ کوّے کا بچہ تھا اور بری طرح زخمی تھا۔ منّی نے اسے اٹھا لیا اور چاروں طرف دیکھا کہ شاید اس کے ماں باپ آ کر اسے لے جائیں لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ چنانچہ بچوں نے فیصلہ کیا کہ اس بچے کی مرہم پٹّی کریں اور ٹھیک ہونے پر اسے باغ میں چھوڑ دیں۔

ابّا کے فرسٹ ایڈ باکس میں سے دوا نکال کر اس کے زخموں پر لگائی۔ بچوں نے اس کے لیے ایک ڈبّہ میں گھاس پھوس رکھ کر آرام دہ بستر بنایا اور کھانے پینے کا انتظام کیا۔ گھر کے بڑوں نے بچّوں کو کوّا گھر پر نہ رکھنے کا مشورہ دیا لیکن بچوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ ایک

زخمی پرندے کو ایسے ہی نہیں چھوڑیں گے۔ گھر میں جو بھی بنتا بچے اسے کھلاتے۔

چند ہفتوں بعد ہی کوّے کا بچّہ صحت مند ہو گیا۔ اس کے نئے پر نکل آئے۔ وہ منّی کا لاڈلا تھا۔ اسے منّی کی گود میں بہت آرام ملتا تھا۔ ایک دن پڑوس کی ایک لڑکی شالو نے منّی کا مذاق اڑایا کہ وہ ایک کالے کلوٹے کو پال رہی ہے۔ کوّا بھی کوئی پالنے کی چیز ہے۔ پالنا ہے تو طوطا پالو یا کبوتر پالو۔

منّی کو اس کی بات بہت بری لگی اور وہ بولی، ”یہ کالا کلوٹا نہیں بلکہ گورا ہے۔ دوسرے بچے یہ بات سن کر ہنسنے لگے اور سبھی ایک ساتھ ’گورا گورا‘ کہنے لگے۔ کوّے کا بچہ ان کا شور سن کر خوشی سے کاؤں کاؤں کرنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے یہ نام پسند ہے۔ اسی دن سے اس کا نام گورا پڑ گیا۔ انسانوں کے بیچ رہنے سے وہ صاف ستھری چیزیں کھاتا۔ کبھی کوڑے یا خراب چیزوں میں منہ نہ ڈالتا۔ منّی نے کئی بار اسے اڑانے کی کوشش کی لیکن وہ جانے کو تیار نہیں ہوا۔ کبھی اس کی آواز سن کر کوّے چھت کی منڈھیر پر آ جاتے اور اپنی زبان میں کیا کیا باتیں کرتے لیکن وہ ان کے ساتھ نہیں جاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو انسان سمجھنے لگا تھا۔ منّی اسے گورا کہہ کر پکارتی تو دوڑتا ہوا آتا یا کسی اونچی جگہ پر بیٹھا ہوتا تو اڑ کر آ جاتا۔ گورا پورے علاقے میں مشہور ہو گیا تھا۔

ایک دن منّی کی دادی نے اسے سمجھایا کہ گورے کو اس کی برادری کے حوالے کر دو وہ ان کے ساتھ خوش رہے گا۔ اس طرح پنجرے میں بند رکھنا اچھی بات نہیں۔

منّی نے دادی کو بتایا کہ وہ بھی یہی چاہتی ہے لیکن گورا جانے کو تیار نہیں ہے۔

ایک دن ابّو کے دوست نے بتایا: ”لال قلعہ کے سامنے پرندوں کا اسپتال ہے۔ وہاں پرندوں کا علاج ہوتا ہے۔ اس اسپتال میں بے سہارہ پرندوں کے رہنے کا بھی انتظام ہے۔ میں نے وہاں کئی کوے دیکھے ہیں۔ یہ ان کے ساتھ خوش رہے گا۔ لیکن منّی

گورے کو نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے سب سے کہا کہ گورا یہاں بہت خوش ہے۔ وہ میرے ساتھ کھیلتا ہے۔ میرا کہنا مانتا ہے۔ کوئی گندگی نہیں کرتا۔ جو کچھ ہم کھاتے ہیں اسے بھی کھلا دیتے ہیں۔ پھر میں کیوں اسے بے سہارہ پرندوں کے ساتھ چھوڑوں۔

منّی کی بات سن کر سب خاموش ہو گئے۔

ایک دن منّی اسکول گئی ہوئی تھی تو ابّو گورے کو پرندوں کے اسپتال میں چھوڑ آئے۔

منّی کو بتایا کہ کچھ کوّے آئے تھے اور منڈھیر پر بیٹھ کر خوب شور مچا رہے تھے۔ گورا ان کے ساتھ چلا گیا۔ چلو اچھّا ہوا۔

یہ سن کر منّی بہت روئی۔ اس روز اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ گھر والوں نے بہت سمجھایا لیکن وہ سمجھنے کو تیار نہیں ہوئی۔ اسے گورا بہت یاد آ رہا تھا۔ اسے جو کوّا نظر آتا وہ اسے گورا سمجھتی اور نام لے کر پکارتی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ باغ میں جا کر تلاش کیا لیکن گورا نہیں ملا۔

دن بیتتے گئے اور منّی نے صبر کر لیا کہ اب گورا واپس نہیں آئے گا۔

ایک دن منّی اسکول سے گھر آ کر کھانا کھا رہی تھی کہ چھت سے کسی کوّے کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز تو گورے کی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی صحن میں آئی اور چھت کی طرف دیکھا۔ وہاں گورا بیٹھا تھا۔ شاید اس نے پرندوں کے اسپتال سے خود کو آزاد کر لیا تھا۔ وہ اڑتا ہوا آیا اور منّی کے کندھے پر بیٹھ گیا۔ منّی خوشی سے چلّانے لگی گورا آ گیا، گورا واپس آ گیا۔

ملہوترا کی مہندی

''ہندوستان کا دل دلّی اور دلّی کا دل چاندنی چوک ہماری مشترکہ تہذیب کا امین ہے۔ تین صدیاں گزر چکی ہیں اور آج بھی یہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کا اہم مرکز ہے۔ یہ بازار تاریخی عمارتوں، عبادت گاہوں، کوچوں اور حویلیوں کا خوب صورت سنگم ہے۔'' ملہوترا مہندی والے نے عالیہ کو یہ باتیں خالص اردو میں بتائیں۔ ملہوترہ مہندی والے کی دکان کٹرہ نیل میں ہے۔ یہ ایک پرانی دکان ہے جس میں مہندی اور پوجا کا سامان پرانے طرز کے پیتل کے برتنوں میں رکھا جاتا ہے۔ عالیہ کی خالہ اسی دکان سے مہندی خریدتی ہیں۔ انہوں نے ہی عالیہ کو بتایا تھا کہ ملہوترا کی دکان سے اچھی مہندی کہیں اور نہیں ملتی۔

عالیہ جس وقت ملہوترا مہندی والے کی دکان پر گئی تو اس نے دیکھا درمیانہ قد کے ایک گورے چٹے بزرگ جنھوں نے چشمہ لگا رکھا تھا بندروں کو کیلے اور آم اچھال اچھال کر دے رہے تھے۔ کسی نے بتایا یہی ملہوترا جی ہیں۔ عالیہ نے ان کو بتایا کہ وہ ان کی دکان سے مہندی خریدنے آئی ہے تو ملہوترا جی نے اپنی دکان پر رکھے پرانے اسٹول پر بیٹھنے کو کہا۔ جب سارے کیلے اور آم ختم ہو گئے تو وہ دکان پر آئے اور عالیہ سے پوچھا مہندی کس کام کے لیے چاہیے۔ عالیہ نے بتایا میرے اسکول میں مہندی لگانے کا مقابلہ ہے۔ جس

کی مہندی کا ڈیزائن اور کلر سب سے اچھا ہوگا اسے انعام ملے گا۔ میری خالہ نے آپ کی دکان کا پتہ دیا ہے۔ ملہوترا جی اپنے پرانے گراہکوں کو جانتے تھے۔ انہوں نے عالیہ سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے اپنے خالو عبدالرحیم کا نام لیا اور ملہوترا جی پہچان گئے۔ انہوں نے بتایا کہ میں کئی طرح کی مہندی بیچتا ہوں۔ بالوں میں لگانے والی، ہاتھ پاؤں میں لگانے والی اور سردیوں والی مہندی۔

ملہوترا جی نے بتایا، ''ہم سردیوں کے لیے الگ مہندی بناتے ہیں۔ دراصل مہندی کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ ٹھنڈی تاثیر ختم کرنے کے لیے لونگ اور دوسری جڑی بوٹیاں ملاتے ہیں۔

عالیہ کو ان کی باتیں بڑی دلچسپ لگ رہی تھیں۔ ملہوترا جی مہندی بیچتے بیچتے چاندنی چوک اور اس کی تہذیب کے بارے میں بہت کچھ بتا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ انہیں چاندنی چوک سے عشق ہے اور اس کا ذکر کرنے میں وہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا یہ دکان اکبر شاہ ثانی کے دور کی ہے۔ ہولی، دیوالی اور پوجا کا سامان ہماری ہی دکان سے لال قلعے میں بھی جاتا تھا۔ اس لئے ہمارے اجداد کی بہت عزت تھی۔ وہ آپسی محبت اور خیر خواہی کا دور تھا۔ ہمارے تہوار اور میلے ٹھیلے ہماری ثقافت کا حصّہ تھے۔

اسی بیچ ملہوترا جی دکان کے اندر گئے اور پلاسٹک کی ایک ڈبیہ لے کر آئے۔ ڈبیہ کھولی تو دکان میں گلاب اور کافور کی خوشبو پھیل گئی۔ ڈبیہ میں ملتانی مٹی جیسا پیسٹ تھا۔ ملہوترا جی نے بتایا کہ کچھ لوگ ہولی پر رنگ لگوانا پسند نہیں کرتے۔ کچھ لوگوں کو رنگوں سے الرجی ہوتی ہے۔ اس لیے ہم نے یہ خاص رنگ بنوایا ہے۔ اس سے نہ تو کپڑوں پر داغ دھبّے پڑتے ہیں اور نا ہی الرجی ہوتی ہے۔ لو ایک ڈبیہ تم بھی رکھ لو، یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔

انہوں نے مہندی کا پیکٹ اور سوکھے رنگ کی ڈبیہ ایک تھیلی میں رکھ کر عالیہ کو دی۔ عالیہ

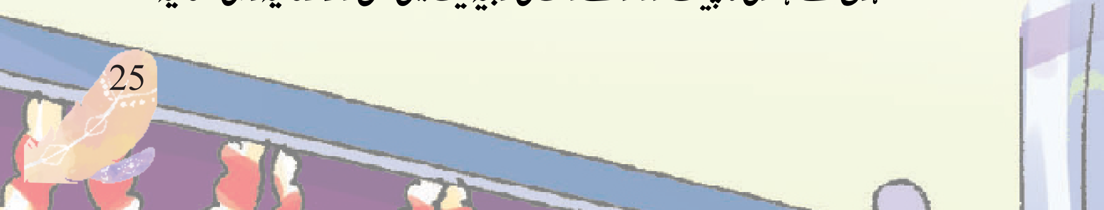

پرس سے پیسے نکالنے لگی تو ملہوترا جی نے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا: ''بیٹا! تمہارے اسکول میں مہندی لگانے کا مقابلہ ہے۔ اگر تم کو انعام مل گیا تو وہی میری مہندی کی قیمت ہوگی۔
عالیہ نے ملہوترا جی کو پیسے دینے کی کوشش کی لیکن انہوں نے بڑے پیار سے منع کر دیا۔
جب وہ دکان سے باہر آئی تو ملہوترا جی بولے: ''اپنی خالہ کو میرا اسلام کہنا۔''

ملہوترا جی کی دکان پر جا کر عالیہ کو بہت اچھا لگا۔ ان کی باتوں سے ہماری شاندار تہذیب اور روایات کی بُو آ رہی تھی۔ وہ رکشہ میں سوار ہوئی اور رکشہ بَلّی ماران کی تنگ گلیوں سے گزرنے لگا۔ اسے ایسا لگا کہ وہ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے دور کو محسوس کر رہی ہے جو محبت، بھائی چارے اور اخوت کا دور تھا۔

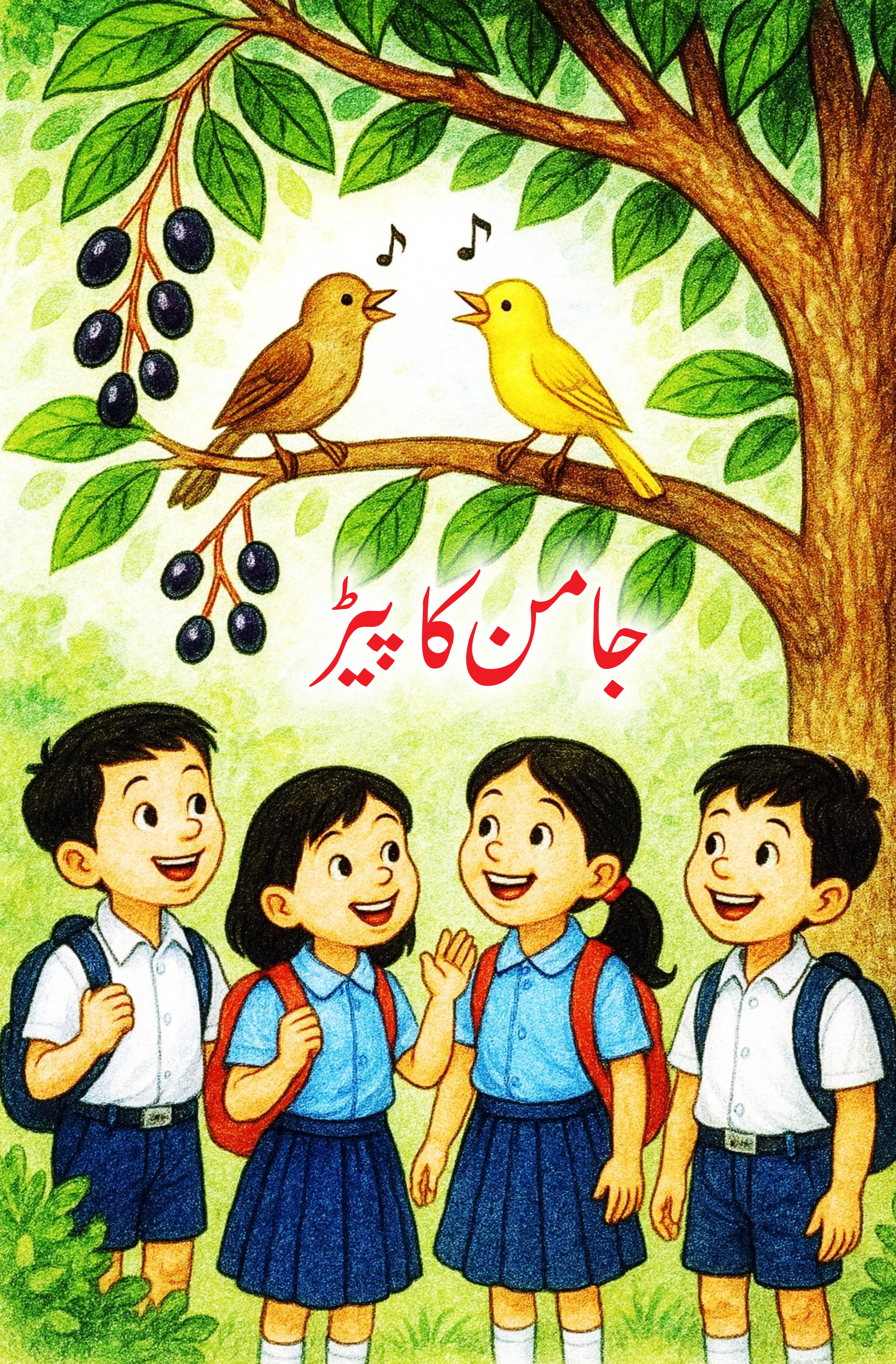
جامن کا پیڑ

★

دادا جان بتاتے تھے جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا، گلی کے کنارے لگے جامن کے پیڑ کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ بہت پرانا پیڑ ہے اور اسی کی مناسبت سے ہماری گلی کا نام جامن والی گلی ہے۔ اس پیڑ پر آج بھی موسمِ گرما میں جامنیں اگتی ہیں۔ گچھّے کے گچھّے لگتے ہیں۔ حالانکہ بازار میں ایک سے ایک جامن بکتی ہے لیکن پیڑ سے جامن توڑ کر کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ پرانے مکان دھیرے دھیرے ختم ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ کئی منزلہ فلیٹ تعمیر ہو رہے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ شہر سے ہریالی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ چڑیاں، بلبل، مینا اور کبوتر ان درختوں میں گھونسلے بناتے تھے، ان کے بھی آشیانے اجڑ گئے۔ درخت نہ ہونے سے شہر میں ایک گھٹن سی ہے۔

ہمارے محلّے میں دو ہی پیڑ بچے ہیں۔ ایک سرکاری اسکول کے صحن میں پیپل کا پیڑ اور دوسرا ہماری گلی میں جامن کا پیڑ۔ یہ پیڑ راجہ بھائی کے مکان سے ملا ہوا ہے بلکہ اس کا آدھا حصّہ تو ان کے آنگن میں ہے۔ راجہ بھائی کے لڑکوں کی شادی کے بعد انھوں نے یہی سوچا کہ مکان کو تڑوا کر دوبارہ تعمیر کرائیں۔ گراؤنڈ فلور پر دکان ہے اور اس کے اوپر تین منزلہ عمارت بن جائے گی لیکن زیادہ جگہ حاصل کرنے کے لیے جامن کا پیڑ کاٹنا پڑے گا۔

ابّا نے اس بات کا ذکر کیا تو فہیم شبانہ اور گڈّو کو بہت دکھ ہوا کہ اتنا پرانا پیڑ جس سے ان کی گلی کی پہچان ہے اسے کاٹ دیا جائے گا۔ گلی کے بچوں اور بڑوں کی زبان پر پیڑ کی چرچا شروع ہو گئی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اتنے پرانے پیڑ کو کاٹ دیا جائے۔ راجہ بھائی کے دو پوتے اسد اور اسلم ہیں۔ بچوں نے ان سے بات کی۔ اسلم اور اسد نے بھی بچوں کی ہاں میں ہاں ملائی کہ اس پیڑ کو نہیں کٹنا چاہیے۔ شبانہ، فہیم اور گڈّو نے اپنے ابّا سے بات کی کہ وہ راجہ بھائی کے لڑکوں سے بات کریں کہ وہ اس پیڑ کو نہ کٹوائیں۔ ابّا نے کہا انہیں بڑے مکان کی ضرورت ہے۔ پیڑ کاٹنے کے بعد وہاں چھجّے نکلیں گے اس لیے وہ اس پیڑ کو کٹوا رہے ہیں۔

ابّا کا جواب سن کر بچوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔

محلے کے زیادہ تر بچے اسکول سے آنے کے بعد مسجد میں قرآن شریف پڑھنے جاتے تھے۔ وہاں بھی درخت کے کاٹے جانے کی بات ہو رہی تھی۔ اسلم اور اسد بھی قرآن شریف پڑھنے آتے تھے۔ ایک دن سب بچوں نے امام صاحب سے درخواست کی کہ وہ راجہ بھائی کے لڑکوں سے بات کریں کہ وہ جامن کے درخت کو نہ کاٹیں۔ ہوسکتا ہے وہ آپ کی بات مان لیں۔ امام صاحب نے بچوں کے کہنے پر راجہ بھائی کے لڑکوں سے بات کی کہ وہ جامن کے پیڑ کو نہ کٹوائیں۔ انہوں نے مذہبی نقطہ نظر سے درختوں کی اہمیت سمجھائی۔ راجہ بھائی کے بیٹوں نے ان کی بات غور سے سنی اور کہا کہ ان کا خاندان بڑا ہو رہا ہے اور جگہ کم پڑ رہی ہے۔ اس لیے مجبوری ہے کہ ہمیں یہ پیڑ کٹوانا پڑ رہا ہے۔

بچے بہت اداس تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جامن کا پیڑ کٹے۔ لہٰذا گلی کے سبھی بچوں نے اس درخت کو بچانے کے لیے پروگرام بنایا اور اس کو نام دیا ''مجھے جینے دو''۔ اس پروگرام کے تحت بچوں نے ڈرائنگ شیٹ پر کچھ نعرے لکھے اور انہیں آس پاس کی

گلیوں میں چپکا دیا۔ درخت پر بھی کچھ پوسٹر بنا کر لگا دیے۔ بچوں کی ان کوششوں سے جامن کا درخت پورے محلے اور راہ گیروں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

یہ دیکھ کر راجہ بھائی کے لڑکوں نے بچوں کو گھر بلا کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ بات کو سمجھیں۔ اگر انہیں جامنیں کھانے کو شوق ہے تو ہر موسم میں وہ ٹوکرا بھر کر انہیں جامنیں کھلائیں گے۔ لیکن بچوں نے ان کی بات نہیں مانی اور بات چیت ناکام ہوگئی۔ راجہ بھائی کے لڑکوں نے اسلم اور اسد کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ گلی کے بچوں کے ساتھ نہ رہیں اور ان کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ محلّے کے سمجھ دار لوگوں نے بچوں کا یہ جذبہ دیکھا تو انہوں نے بھی درخت نہ کاٹنے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ایک روز وہاں سے کسی اخبار کا رپورٹر گزر رہا تھا۔ اس نے درخت پر لگے پوسٹرس اور نعرے دیکھے تو اس نے ان کی تصویریں کھینچیں اور اخبار میں خبر لگا دی۔ اس خبر کو دیکھ کر دوسرے اخبار والے اور ٹی وی چینل بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے فہیم شبانہ اور گڈو کی کوششوں کی تعریف کی۔ جامن کا درخت پورے شہر میں مشہور ہو گیا۔ اس کے باوجود راجہ بھائی کے لڑکے اسے کٹوانے پر مصر تھے۔ ایک دن انہوں نے لکڑہاروں کو بلوایا۔ وہ بڑی بڑی آریاں، کلہاڑیاں اور رسّے لے کر پہنچ گئے۔ بچوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو سبھی جامن کے پیڑ کو بچانے دوڑے۔ محلّے کے زیادہ تر بچے ان کے ساتھ مل گئے اور سبھی اس درخت کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ عجب تماشہ تھا۔ محلّے کے لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے اور جامن کے درخت کو بچانے کے لیے نعرے لگانے لگے۔ معاملے نے اتنا طول پکڑا کہ میونسپلٹی کے ممبران اور افسران بھی وہاں پہنچ گئے۔ علاقہ کے ممبر نے راجہ بھائی کے لڑکوں کو سختی سے منع کر دیا کہ آپ اس پیڑ کو نہیں کٹوا سکتے۔ بلکہ وہاں ایک نوٹس بھی چسپاں کر دیا گیا کہ اس پیڑ کو کاٹنے والے کے خلاف قانونی کارروائی ہوگی۔

بالآخر راجہ بھائی کے لڑکے راضی ہو گئے اور انہوں نے درخت کو بچاتے ہوئے اپنا

مکان تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا۔

اگلے روز فہیم، شبانہ اور گڈو اسکول پہنچے تو سبھی نے ان کی تعریف کی۔ کچھ دن بعد پرنسپل صاحب نے اسکول میں ایک تقریب منعقد کی اور سرکار کی جانب سے بچوں کو انعام دیا گیا۔

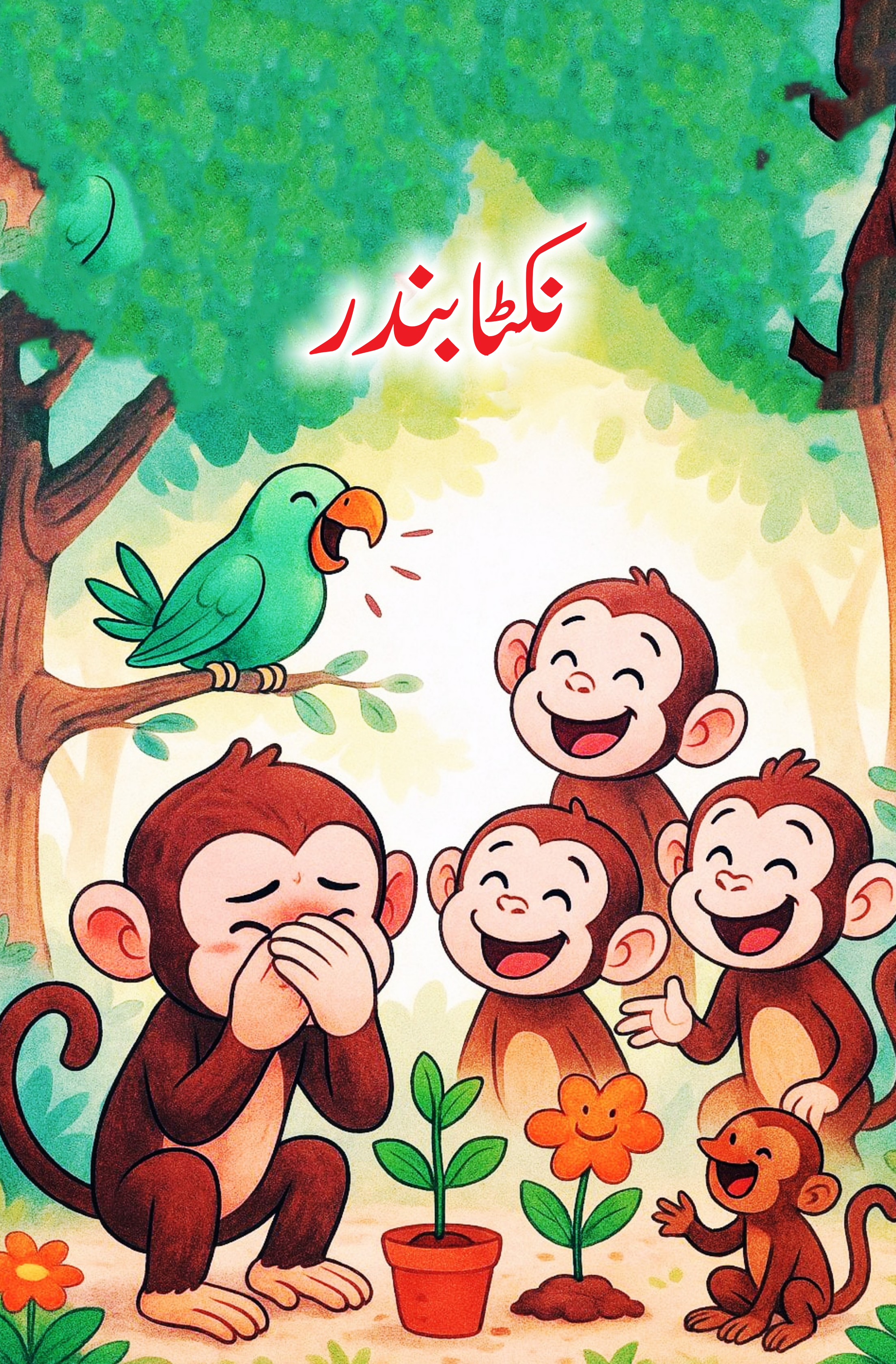
نکٹا بندر

ایک جنگل میں بہت سارے بندر رہتے تھے۔ وہ ایک گھنا جنگل تھا جس میں پھلوں کے بہت سارے درخت تھے۔ ان درختوں سے انگوروں کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ جنگل میں کئی چھوٹے بڑے تالاب تھے جن میں سال بھر پانی بھرا رہتا تھا۔

بندر اپنا زیادہ تر وقت درختوں پر گزارتے تھے۔ وہ کبھی کبھی تالاب پر پانی پینے آتے تھے۔ اس جنگل میں سبھی جانور اور پرندے مل جل کر رہتے تھے۔ کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔

بندروں کے سردار کا ایک بیٹا بہت شیطان تھا۔ اس کا نام چنکو تھا۔ چنکو کو روز نئی نئی شرارتیں سوجھتی تھیں۔ اس کے ساتھی بھی اسی کی طرح شریر تھے۔ بندروں کے سردار نے سبھی بندروں سے کہہ رکھا تھا کہ کسی پرندے کے گھونسلے کے پاس مت جانا اور نہ ہی ان کے بچوں کو پریشان کرنا۔ بندر اپنے سردار کی بات مانتے تھے اور کبھی کسی پرندے کے گھونسلے کے قریب بھی نہیں جاتے تھے۔

ایک بار چنکو کو نئی شرارت سوجھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا ہم روز روز ایک جیسے پھل اور سبزیاں کھا کھا کر پریشان ہو گئے ہیں۔ چلو کوئی نئی چیز کھاتے ہیں چنکو کے ساتھی

بولے کہ نئی چیز کیا ہو سکتی ہے جو پھلوں اور سبزیوں سے الگ ہو۔ چنکو نے کچھ سوچ کر کہا۔ کچھ دور ایک گھنا درخت ہے اس پر بہت سارے پرندے رہتے ہیں کیوں نا ان کے انڈوں پر ہاتھ صاف کیا جائے۔

یہ سن کر اس کے ساتھی ڈر گئے۔ انہوں نے چنکوں کو سمجھاتے ہوئے کہا اگر سردار کو پتہ چل گیا تو سخت سزا دیں گے۔ نہ بابا نہ ہم اس کام میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ چنکو نے انہیں سمجھایا کہ سردار میرا باپ ہے۔ میرے ہوتے ہوئے وہ کوئی سخت سزا نہیں دیں گے۔ صرف ڈانٹیں گے۔ ہم چپ چاپ ان کی ڈانٹ سن لیں گے اور کہہ دیں گے کہ کی غلطی ہو گئی۔ اس کے باوجود اس کے ساتھی پرندوں کے انڈے کھانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

ایک دن چنکو چپکے سے اس پیڑ پر پہنچ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور زیادہ تر پرندے دانہ چگنے گئے ہوئے تھے۔ اس نے جلدی جلدی گھونسلوں سے انڈے چرائے اور کھا گیا۔ اسے انڈے بڑے مزیدار لگے۔

شام کو پرندے اپنے گھونسلوں میں دانا چگ کر واپس آئے تو ان کے انڈے غائب تھے۔ وہ زور زور سے چلاّنے لگے کہ ان کے انڈے کہاں گئے۔ انہیں پریشان دیکھ کر چنکو کو بڑا مزہ آیا اور وہ منہ دبا کر خوب ہنسا۔

کچھ دن بعد وہ دوبارہ اسی درخت پر گیا اور انڈے توڑ کر کھا گیا۔ ابھی تک اس کی شرارت کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔

جب پرندوں کو پتہ چلا کہ کوئی ان کے انڈے چرا رہا ہے تو انہوں نے چور کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ پرندوں کا سردار گرینی طوطا تھا۔ گرینی نے کہا سارے پرندے دانہ چگنے نہیں جائیں گے۔ درخت پر ایک کھوہ میں کوئی پرندہ چھپ کر بیٹھ جائے گا اور آس پاس نظر رکھے گا۔

اس دن کے بعد جب پرندے دانے کی تلاش میں نکلتے تو ایک پرندہ کھوہ میں چھپ کر بیٹھ جاتا اور چاروں طرف نظر رکھتا۔

ایک دن برابر والے برگد کے درخت پر کچھ ہلچل ہوئی اور چوکیدار پرندہ ہوشیار ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ چنکو بندر چپکے چپکے ان کے درخت پر آیا اور گھونسلوں میں انڈے تلاش کرنے لگا۔ اسے جہاں بھی انڈے ملے انہیں کھا گیا۔

جب شام کو پرندے واپس آئے تو چوکیدار پرندے نے انہیں سب بتا دیا کہ یہاں سے کچھ دور ایک درخت پر بندر رہتے ہیں انہیں میں سے ایک چھوٹا بندر سارے انڈے برباد کر دیتا ہے۔

گرینی طوطے نے یہ سن کر چنکو بندر کو سبق سکھانے کی ٹھانی۔ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد کہا میں اس بدمعاش بندر کو سبق سکھاؤں گا۔ وہاں سے تھوڑی دور اس درخت پر چھید کر کے کھٹ بڑھئی نے گھونسلہ بنا رکھا تھا۔ کھٹ بڑھئی کی چونچ بہت تیز ہوتی ہے وہ کسی بھی چیز کو چند سیکنڈ میں توڑ پھوڑ سکتی ہے۔ گرینی نے اسے بتایا کہ میں بندر کو تمہارے گھونسلے تک لے کر آؤں گا جب وہ گھونسلے میں جھانکے تو تم جھٹ سے اس پر حملہ کر دینا۔

ایک دن چنکو ایک درخت کی موٹی ڈال پر الٹا لیٹا آرام کر رہا تھا کہ گرینی طوطا اس کے پاس آیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں اس کو بتایا کہ جنگل میں ایک ایسا پرندہ بھی ہے جو ایک بار میں پندرہ بیس انڈے دیتا ہے۔ کیا تم اس پرندے کو جانتے ہو۔ چنکو نے پہلی بار ایسے پرندے کے بارے میں سنا تھا۔ اسے اس بارے میں جاننے کی خواہش ہوئی۔ گرینی نے اسے اس درخت کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اس نے کل ہی بہت سارے انڈے دیے ہیں۔ انڈوں کے بارے میں سن کر چنکو کے منہ میں پانی آ گیا۔ اس نے سوچا: ”ایک ہی بار میں اتنے انڈے مل جائیں تو مجھے دوسرے

درختوں پر چوروں کی طرح چھپ کر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ گرینی وہاں سے اڑا اور کھٹ بڑھئی کے پاس جا کر اسے بتایا کہ شرارتی بندر آنے ہی والا ہے۔تم تیار رہنا اور خود چھپ کر چنکو کا انتظار کرنے لگا۔تھوڑی دیر میں چنکو اس درخت تک پہنچ گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ وہ کسی طرح کھُٹ بڑھئی کے گھونسلے تک پہنچا۔ وہاں ایک چھوٹا سا چھید تھا۔اس میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے وہ اندر جھانک کر دیکھنا چاہتا تھا کہ کتنے انڈے ہیں۔اس نے چھید میں جھانکا تو اندر اندھیرا تھا۔اسے انڈوں کی بُو آ رہی تھی۔اس نے اپنی ناک اس چھید پر لگا دی تا کہ انڈے چرانے سے پہلے ان کی بُو سے لطف اندوز ہو۔اچانک اندر بیٹھے کھٹ بڑھئی نے اس کی ناک پر تابڑتوڑ حملے کر دیے۔اس کی چونچ اتنی مضبوط اور تیز تھی کہ چنکو کی ناک کئی جگہ سے کٹ گئی۔وہ بری طرح ڈر گیا اور دُم دبا کر بھاگا۔اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک یہ کیا ہوا۔اس کی ناک سے خون نکل رہا تھا اور سخت تکلیف تھی۔وہ ڈر کے مارے اپنے گھر بھی نہیں گیا اور تالاب پر جا کر اپنا چہرہ دیکھا۔ناک کا اگلا حصہ کٹ گیا تھا اور اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔اس نے پانی سے اپنی ناک دھوئی اور وہیں بیٹھے بیٹھے رونے لگا، ہائے میری ناک کٹ گئی۔اب میں اپنے گھر والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔شام کو اندھیرا ہو گیا تو وہ اپنے درخت پر چلا گیا۔اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ساری رات ناک میں درد رہا۔نا جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح اس کی ماں نے اسے ہلایا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔جھنڈ کے سارے بندر اس کے پاس جمع تھے اور سبھی پوچھ رہے تھے کہ تمہاری ناک کیسے کٹی۔چنکو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔

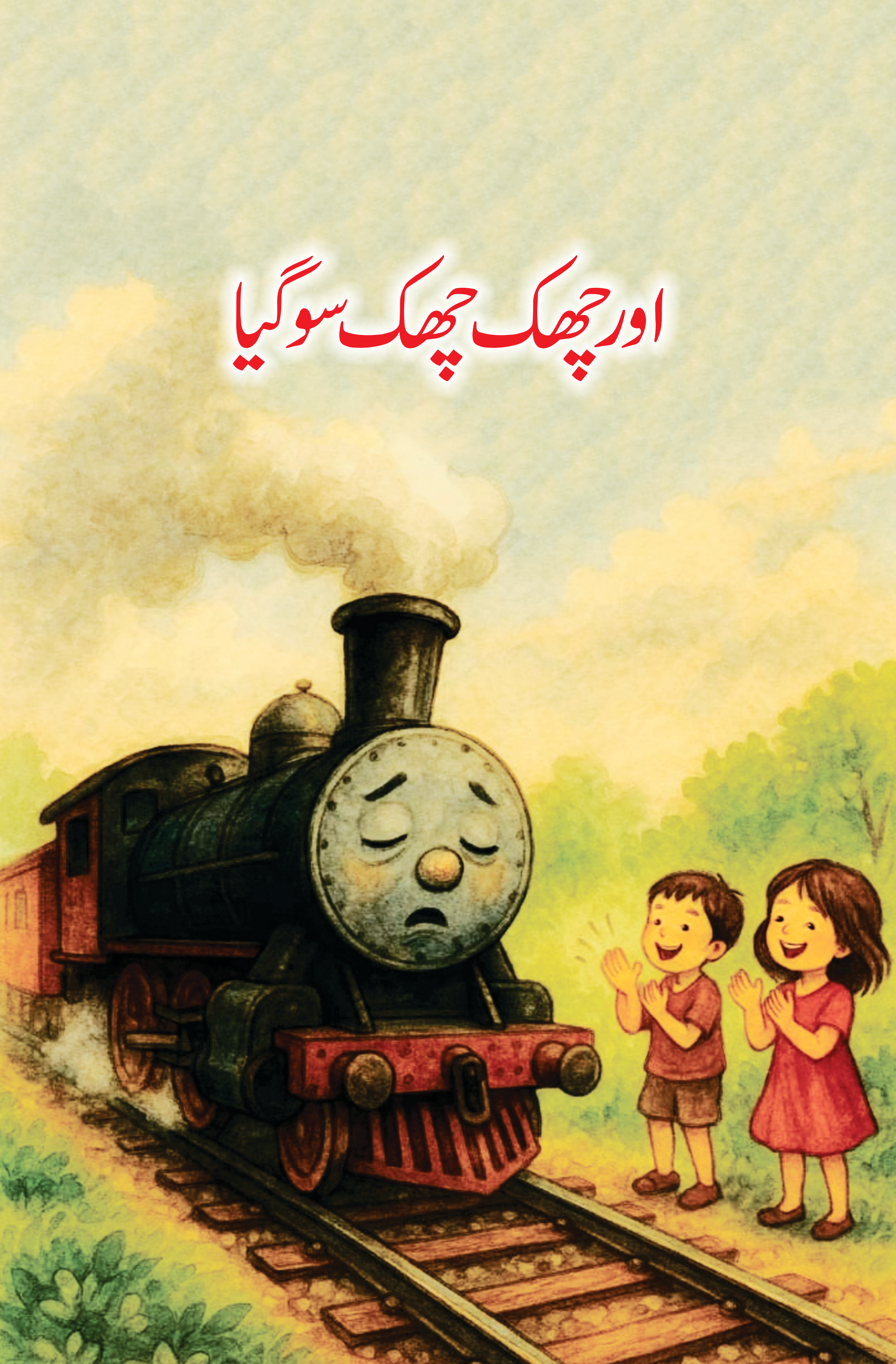
اور چھک چھک سو گیا

★

بھوپال سے دلّی کا دس گھنٹے سفر طے کرنے کے بعد چُھک چُھک انجن کو کافی تھکان محسوس ہو رہی تھی۔ فرید آباد پہنچ کر اس کی جان میں جان آئی کیونکہ آدھے گھنٹے بعد دلّی کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ تھکان کی وجہ سے اس نے بھی اپنی رفتار کم کر دی تھی۔ اب وہ ایسے مسافر کی طرح چل رہا ہے جسے منزل قریب ہونے کا احساس ہمّت دے دیتا ہے اور وہ تھکے تھکے قدموں سے بغیر رکے منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ فرید آباد کی فیکٹریوں سے نکلتے دھویں میں مختلف بوئیں ملی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر فیکٹریاں پٹریوں کے قریب تھیں۔ ان میں سے جلے ہوئے تار کی بو آ رہی تھی۔ کہیں سے تارکول جیسی اور کہیں تو اس قدر ناگوار کہ وہاں سے جلدی آگے بڑھنے کا دل چاہتا لیکن چھک چھک خراماں خراماں اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ اس کے پیچھے پچیس بوگیاں جڑی ہوئی تھیں۔ ریل گاڑی کی رفتار ہلکی ہونے پر کافی تعداد میں مسافر راستے میں اتر رہے تھے۔ پٹریوں کے کنارے رہنے والے بچے بڑے شوق سے چھک چھک کو دیکھ رہے تھے۔ دراصل چھک چھک اپنی نسل کا آخری انجن تھا جو پندرہ سال سے دلّی اور بھوپال کے بیچ چل رہا تھا۔ اس نے اب تک لاکھوں افراد کو اِدھر سے اُدھر پہنچایا تھا۔ کتنے ایسے لوگ تھے جو چھٹی کے دنوں کو چھوڑ کر

روزانہ اس کے ساتھ لگی بوگیوں میں سفر کرتے تھے۔ کچھ نے صرف ایک بار اس میں سواری کی۔ کافی لوگوں کی روزی روٹی اس سے جڑی ہوئی تھی۔ چائے والے، سموسے والے، بھیل پوری والے، ہاضمے کی گولیاں بیچنے والے، تالے والے، کھلونے والے اور بھکاری اس میں سوار ہو کر روزی روٹی کا بندوبست کرتے تھے۔ کتنے ہی لوگ دلّی سے سوار ہو کر ملازمت کے لیے جاتے تھے اور کتنے ہی بھوپال سے چڑھ کر گوالیار اور جھانسی تک کام کرنے کے لیے جاتے تھے۔ کتنی باراتیں اس میں گئی تھیں، کتنے مریض اس میں سوار ہو کر دلّی علاج کرانے آتے تھے۔ اسے اس بات کا فخر تھا کہ وہ پندرہ سال سے انتھک لوگوں کی خدمت کر رہا تھا۔ وہ اب بوڑھا ہو چکا تھا اور آج اس کے ریٹائرمنٹ کا دن تھا۔

اسے وہ دن یاد آیا جب پندرہ سال پہلے وہ دولہا کی طرح سج کر نظام الدین ریلوے اسٹیشن کی پٹریوں پر کھڑا تھا۔ ریلوے کے وزیر اور بڑے بڑے افسروں نے جھنڈی دکھا کر اسے روانہ کیا تھا۔ فوٹو گرافروں نے اس کے فوٹو کھینچے تھے۔ اخبارات اور ٹیلی ویژن میں اس کی تصویریں چھپی تھیں۔ کتنا سہانا سفر تھا وہ۔ اس نے بڑے فخر سے سیٹی بجا کر اپنے چلنے کا اعلان کیا تھا اور دھک دھک دھک دھواں چھوڑتا ہوا وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اس کی سیٹی میلوں تک سنائی دیتی تھی۔ ڈرائیور اسے اپنے خاندان کا فرد سمجھتے تھے۔ کوئلہ اور پانی اس کی غذا تھے اور اس کی سانسوں سے خارج ہونے والی بھاپ اس کی توانائی تھی۔ وہ نہ دن کی پرواہ کرتا تھا نہ رات کی، نہ طوفان اسے روک سکتے تھے نہ بارش اور بجلیاں، ہڈّیاں پگھلا دینے والی گرمی ہو یا خون جما دینے والی ٹھنڈ، وہ میدان میں ڈٹا رہتا تھا۔ اس کی نظر صرف اپنی منزل پر ہوتی اور یہی دھن ہوتی کہ مسافروں نے اس پر جو اعتماد کیا ہے وہ اس پر کھرا اترے۔

پندرہ سال میں اس کے کئی دوست بنے۔ کچھ پرانے انجن تھے جو اس کے سامنے

ریٹائر ہو کر یا تو ریلوے میوزیم کی زینت بنے یا کباڑ کے قبرستان میں دفن کر دیے گئے۔ چھک چھک بھی میوزیم میں رکھا جانے والا تھا۔ یہاں وہ لمبی نیند سوئے گا اور ریلوے کی تاریخ میں اپنا نام درج کرا لے گا۔ اس کے ذہن میں وہ تمام راستے فلم کی طرح چل رہے تھے جہاں جہاں وہ گزرا تھا۔ میدان، کھیت، جنگل، پہاڑیاں، ندیوں پر بنے پُل نالے اور ٹیلے سب اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ اس نے بڑی تعداد میں جنگلوں کو اجڑتے دیکھا تھا۔ کئی قصبوں کو شہروں میں بدلتے دیکھا اور گاؤں کو قصبوں میں، کتنے کھلیان صنعتی علاقوں میں تبدیل ہو کر آکسیجن کے بدلے کاربن اور دوسری زہریلی گیس اگلنے لگے۔

کئی پہاڑیوں اور چٹّانوں کے سینے چیر کر انجینئروں نے اس کے لیے راستے بنائے، پرانے اسٹیشن جدید اسٹیشنوں میں تبدیل ہوئے اور کئی نئے اسٹیشن وجود میں آئے۔ وہ اپنے پندرہ سال کے سفر کے بارے میں سوچتا ہوا دلّی میں داخل ہو گیا۔ تغلق آباد کا چھوٹا سا اسٹیشن آچکا تھا۔ اس نے آخری بار اسے دیکھا۔ آس پاس بنے مکانوں اور گلیوں کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ نہ جانے آج اس کی خواہش کیوں ہو رہی تھی کہ اس کی منزل اور دور ہو جائے اور وہ اور سست روی سے وہاں تک پہنچے۔ وہ ان جگہوں کو دیر تک دیکھے جنہیں وہ پندرہ سال سے دیکھ رہا تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اس نے آخری سیٹی ماری جو نظام الدّین ریلوے اسٹیشن تک پہنچی۔ اس نے اپنی رفتار اور کم کر دی تھی۔ حسب سابق مسافر چلتی ریل گاڑی سے اترنے لگے۔ پٹریاں پار کرنے والے سائیکلوں سے اتر کر اس کے گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ بچے آج بھی اسے اسی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے جیسے پندرہ سال سے دیکھتے آ رہے تھے۔ اوکھلا اسٹیشن تک آتے آتے اس کی رفتار اور کم ہو گئی۔ اس نے دونوں جانب بنے خوب صورت مکانوں کو دیکھا اور پندرہ سالوں میں وہاں جو بھی تبدیلی آئی تھی اس کے بارے میں سوچا۔

دلّی شہر اتنی تیز رفتار زندگی جی رہا تھا۔ روز نئے نئے تماشے، نئے مسائل، نئی دریافتیں ہو رہی تھیں۔ چھک چھک کی جگہ دوسرا الیکٹرک انجن اسی راستے پر چلنے والا تھا۔ جب چھک چھک آشرم اور بھوگل کے بیچ مِل کے نیچے سے گزرا تو ڈرائیور نے اس کی بھاپ خارج کرنی شروع کر دی۔ چھک چھک چھک چھک چھووو۔۔۔ چھووو یہ آواز بہت اچھی لگ رہی تھی۔ چھک چھک کو اپنی آنکھیں بھاری ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں آج اسے پہلی بار اپنے بوڑھا ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بمشکل قدم اٹھا رہا تھا جہاں آج اس کا سفر ختم ہونا تھا اور اسے دوبارہ رنگ وروغن کر کے سجا دھجا کر ریلوے میوزیم جانا تھا جہاں بچے اسے دیکھنے کے لیے آئیں گے جنہیں بتایا جائے گا کہ کسی زمانے میں ریل بھاپ کے انجن سے چلتی تھی۔ وہ نظام الدّین ریلوے اسٹیشن پہنچا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے ایک لمبی آہ لی۔۔۔ چھووو۔۔۔ چھووو اور پلیٹ فارم پر رک کر نیند کی پری کی آغوش میں چلا گیا۔

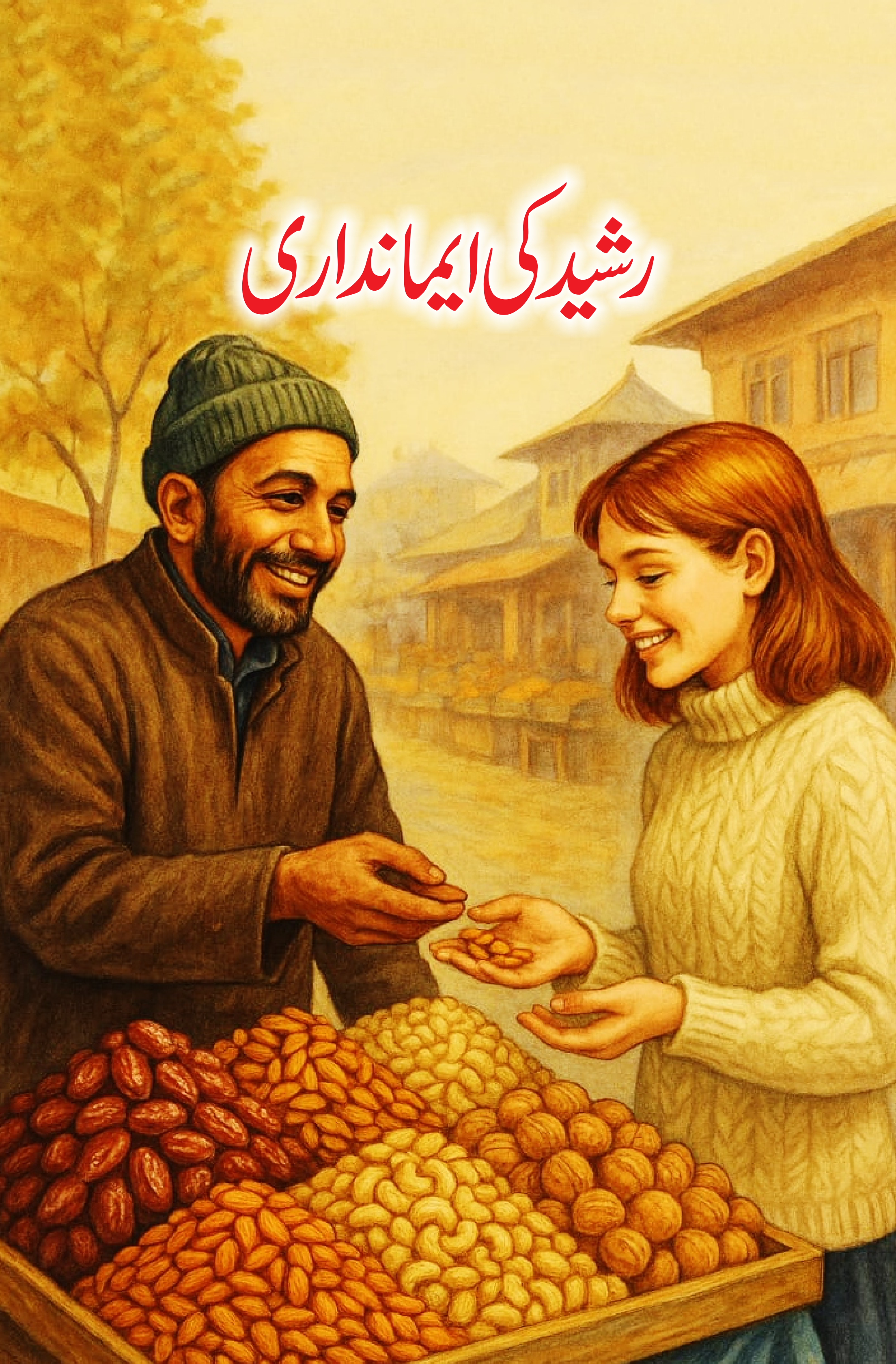
رشید کی ایمانداری

★

نومبر میں جیسے ہی ٹھنڈ پڑنا شروع ہوتی ہے۔شمالی ہند کے شہروں میں بڑی تعداد میں کشمیری کام کی تلاش میں آنے لگتے ہیں۔ان میں اکثر مزدور پیشہ ہوتے ہیں۔وہ رکشہ چلاتے ہیں،ٹرانسپورٹ گوداموں میں ٹرکوں پر مال چڑھانے اور اتارنے کا کام کرتے ہیں۔کچھ کشمیری شالیں اور سویٹر بیچتے ہیں۔کچھ کئی سال سے خشک میوے بھی سڑکوں کے کنارے ٹھیلوں پر بیچ رہے ہوتے ہیں۔لوگ کشمیر کے اخروٹ،سوکھی خوبانی اور بادام پسند کرتے ہیں۔عام طور پر کشمیری جو میوے بیچتے ہیں ان کے دام کم ہوتے ہیں اور لوگ دکانوں کے بجائے ان سے خریدنا پسند کرتے ہیں۔

پرانی دہلی میں کئی جگہ کشمیری میوہ فروش نظر آتے ہیں۔یہ شہر کے خاص بازاروں مٹیا محل، چاوڑی بازار، سوئی والان، بلّی ماران، ترکمان گیٹ اور سیتا رام بازار میں کھڑے ہوئے ہیں۔

رشید بھی کئی سال سے دہلی میں میوہ بیچنے آتا ہے۔وہ زیادہ تر ترکمان گیٹ بازار اور سیتا رام بازار میں ٹھیلا لیے پھرتا ہے۔اس کے کئی گراہک تو سالوں سے اسے پہچانتے ہیں اور وہ اسی سے میوہ خریدنا پسند کرتے ہیں۔اس روز سردی بڑھ گئی تھی اور رشید شنکر گلی کے باہر ٹھیلا

لیے کھڑا تھا۔شام کے چھ بج چکے تھے اور کئی سبزی و پھل فروش بھی آس پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔عموماً شام کو دفتروں سے آنے والے ان ٹھیلے والوں سے پھل سبزیاں خرید کر لے جاتے تھے۔

اب ہم اس کہانی کے دوسرے کردار سجاتا کی طرف آتے ہیں۔

سجاتا ایک بائیس سالہ نوجوان لڑکی ہے اور وہ گلی شنکر والی میں رہتی ہے۔اس کے والد ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتے تھے اور پچھلے سال ریٹائر ہو گئے۔اس کی والدہ کو دمہ ہے اور وہ گھر پر ہی رہتی ہیں۔سجاتا کا ایک چھوٹا بھائی ہے جو بارہویں جماعت میں پڑھتا ہے۔سجاتا اکیلی کمانے والی ہے اور اس کی تنخواہ پر ہی اس کا گھر چلتا ہے۔وہ ایک محنتی اور خوش اخلاق لڑکی ہے۔وہ نہ تو کسی کو تکلیف میں دیکھ سکتی اور نہ ہی پریشان۔وہ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے کو ہر وقت تیار رہتی ہے۔ وہ روزانہ قرول باغ ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرنے جاتی ہے اور شام کو گھر آتی ہے۔

آج تنخواہ کا دن تھا تو اس نے پیسے اپنے پرس میں سنبھال کر رکھ لیے۔وہ میٹرو سے چاوڑی بازار اسٹیشن پر اتری اور تیز تیز قدموں سے شنکر گلی کی طرف بڑھنے لگی۔حالانکہ اسٹیشن سے دس دس روپئے میں سواری والے رکشہ چلتے ہیں لیکن سجاتا دس روپئے بھی بچانے کی کوشش کرتی ہے۔جب وہ گلی کے قریب آ گئی تو اس کی نظر رشید کے ٹھیلے پر پڑی۔ کشمیر کے میوے دیکھ کر اس کے دل میں خیال آیا کہ ممّی کے لیے اخروٹ اور بادام لے چلوں۔سردی میں انہیں فائدہ ہوگا۔اس نے رشید سے اخروٹ اور بادام کے ریٹ پوچھے اور اپنے پرس سے پیسے نکال کر دیے اور میووں کی تھیلی اور اپنا مفلر اٹھا کر گلی میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد آسمان پر بادل چھا گئے۔بارش کے آثار دیکھ کر سبھی لوگوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی کیونکہ سردی میں بارش میں بھیگنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔رشید بھی جلدی

جلدی بَلّی ماران کی طرف چلا گیا۔ سجاتا گھر پہنچی تو اس کی ممّی اور پاپا انتظار کر رہے تھے۔ ممّی نے اس کے لیے چائے بنائی تھی اور وہ ان کے ہاتھ میں میوہ کی تھیلی پکڑا کر منھ ہاتھ دھونے لگی۔ اس نے کپڑے بدلے اور اپنے والدین کے ساتھ چائے پینے لگی۔ ماں نے اس سے کہا: ''بیٹی یہ بادام اور اخروٹ کیوں لائی ہے۔ تو نے اتنے پیسے خرچ کرڈالے۔''

سجاتا نے مسکراتے ہوئے کہا: ''ممّی آپ کی صحت سے مہنگے نہیں ہیں۔ آپ کو فائدہ دیں گے۔ اس موسم میں آپ کے شریر کو گرمی کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں نے ایک کشمیری بھیّا سے اپنی ممّی کے لیے خریدے ہیں۔''

سجاتا کو خیال آیا کہ تنخواہ کے پیسے ممّی کو دے دوں۔ اس نے میز پر پرس تلاش کیا تو پرس وہاں نہیں تھا۔ اس نے جہاں کپڑے ٹانگے تھے وہاں بھی نہیں ملا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پرس کہاں رہ گیا یہ سوچ کر وہ واش بیسن کی طرف بھاگی اور اس کے بعد زینے میں دیکھا لیکن پرس نہیں ملا۔ اس کے والدین بھی گھبرا گئے۔

پاپا نے پوچھا: ''آخری بار تم نے کہاں رکھا تھا؟

سجاتا نے کہا: یہیں کہیں رکھا تھا۔ میں نے صرف وہ کشمیر بھیّا کے ٹھیلے۔۔۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی اور چپلیں پہن کر گلی کے باہر بھاگی۔ اس کے پاپا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی اور باہر اِکّا دُکّا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ سبھی ٹھیلے والے جا چکے تھے۔

سجاتا گھبرا گئی۔ گلی کے سامنے ایک دکان کھلی ہوئی تھی۔ اس نے وہاں جا کر پوچھا کہ سب ٹھیلے والے کہاں گئے؟ دکان دار نے بتایا کہ بادل چھاتے ہی سب چلے گئے۔

اوہ مائی گارڈ! یہ کہتے ہوئے سجاتا نے اپنا سر پکڑ لیا۔

اس کے پاپا بولے: ''اگر تمہارا پرس کشمیری کو مل گیا ہوگا تو اس کی تو لاٹری نکل گئی

ہوگی۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہارا پرس واپس کرے گا، یا کل یہاں ٹھیلا لگائے گا۔۔‘‘

لیکن سجاتا کا دل کہہ رہا تھا کہ اگر کشمیری میوہ فروش کے پاس پرس ہوگا تو وہ ضرور واپس کردے گا۔ وہ صورت سے ایک سیدھا سادہ اور ایماندار انسان لگ رہا تھا۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر واپس آ گئی۔ جب اس کی والدہ نے باپ بیٹی کو خالی ہاتھ گھر آتے دیکھا تو وہ رونے لگیں۔ وہ کہہ رہی تھی اب پورے مہینے کا خرچ کیسے چلے گا۔ ایسا لگتا تھا کہ سجاتا کا پرس اس پریوار کی خوشیاں اپنے ساتھ لے گیا۔

سجاتا کے والد نے تھانے چل کر کشمیری میوہ فروش کے خلاف رپورٹ درج کرانے کو کہا لیکن سجاتا نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ حالانکہ اس کا دل رو رہا تھا لیکن اس نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کیا ہوا تھا۔ وہ ایک حوصلہ مند لڑکی تھی۔

اس نے اپنے والدین کو سمجھایا کہ اگر ہمارے نصیب میں بھگوان نے نقصان نہیں لکھا ہوگا تو ہمارے پیسے واپس مل جائیں گے۔ کل صبح تک انتظار کرتے ہیں۔

بارش کچھ تیز ہوگئی تھی۔ اسی کے ساتھ ٹھنڈ بھی بڑھ گئی تھی۔ سجاتا کے گھر میں ماتم چھایا ہوا تھا۔ سب کو یہی فکر تھی کہ گھر کا خرچہ کیسے چلے گا۔ پرس کھونے کے غم میں سجاتا نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

رات کو نو بج رہے تھے کہ اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سجاتا کے گھر والوں نے سوچا اتنی رات اور بارش میں کون آیا ہوگا۔ سجاتا کے پاپا نے دروازہ کھولا تو ان کے سامنے رشید کھڑا ہوا تھا۔ وہ بارش میں بھیگا ہوا تھا اور اس کی ٹوپی سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

سجاتا کے پاپا ایک اجنبی مسلمان کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئے اور انہوں نے پوچھا، کون ہو تم ؟

رشید نے جھجکتے ہوئے پوچھا: ''کیا آپ کی ہی بٹیا نے آج اخروٹ اور بادام خریدے تھے؟ اس سے پہلے کہ اس کے والد کچھ کہتے سجاتا رشید کی آواز پہچان گئی اور دوڑتی ہوئی آئی۔ ''ہاں میں نے ہی خریدے تھے۔''

رشید نے اس کا پرس آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ''بی بی! آپ کا پرس میرے ٹھیلے پر رہ گیا تھا۔ جب میں گھر پہنچا اور ٹھیلے سے سامان اتارنے لگا تو مجھے آپ کا پرس نظر آیا۔

سجاتا نے اپنے والد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ انہوں نے نظریں جھکا لیں۔ تبھی سجاتا کی ممّی بولیں۔ بیٹے تم بھیگ گئے ہو۔ کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ آؤ اندر آ جاؤ۔ رشید اندر آتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ سجاتا نے اس کا بازو پکڑا اور اندر لے آئی۔ سجاتا نے تولیہ سے اس کا سر صاف کیا اور اس سے پوچھا: ''تمہیں پتہ ہے اس پرس میں کتنے روپئے ہیں۔ پورے بیس ہزار روپئے۔''

رشید نے مسکراتے ہوئے کہا: ''روپے بیس ہزار ہوں یا بیس لاکھ، آپ کے ہیں۔ میں کیوں لوں گا۔''

سجاتا کے والد نے رشید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''بیٹا انجانے میں ہی تمہیں کیا کیا کہہ گیا۔ میں تو پولیس میں رپورٹ کرانے والا تھا لیکن میری بیٹی نے منع کر دیا۔

تمہیں میرے گھر کا پتہ کیسے ملا۔ سجاتا نے پوچھا۔

آپ کو میں نے اس گلی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ جب میں پرس لے کر آیا تو کئی لوگوں سے پوچھا کہ اس گلی سے کوئی لڑکی آفس کام کرنے جاتی ہے۔ لوگوں نے لڑکیوں کے بارے میں بتایا جو دفتر میں کام کرتی ہیں۔ میں پہلے گھر گیا تو وہ نہیں تھا۔ پھر میں آپ کے گھر آیا۔

جاتا کے پاپا نے رشید کو کچھ پیسے دینے چاہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا

مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ میرے ساتھیوں نے کھانا بنا لیا ہوگا اور وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔

سجاتا کے ممّی پاپا نے اسے چھاتا اور شال دیتے ہوئے کہا: ''تمہاری ایمانداری نے ہمارا دل جیت لیا۔ تم ایک بہترین انسان ہو۔ تم ہمارے بیٹے کی طرح ہو۔ سمجھو آج سے تمہارے ایک ممّی پاپا دلّی میں رہتے ہیں۔ جب دل چاہے ہمارے گھر آ جانا۔ سجاتا بولی ''ایک بہن بھی مل گئی۔''

رشید کی ایمانداری نے اسے پردیس میں وہ چیز دلا دی تھی جس کا دنیا میں کوئی دام نہیں۔ ماں باپ اور ایک بہن کا پیار۔

شہید وطن عبدالحمید

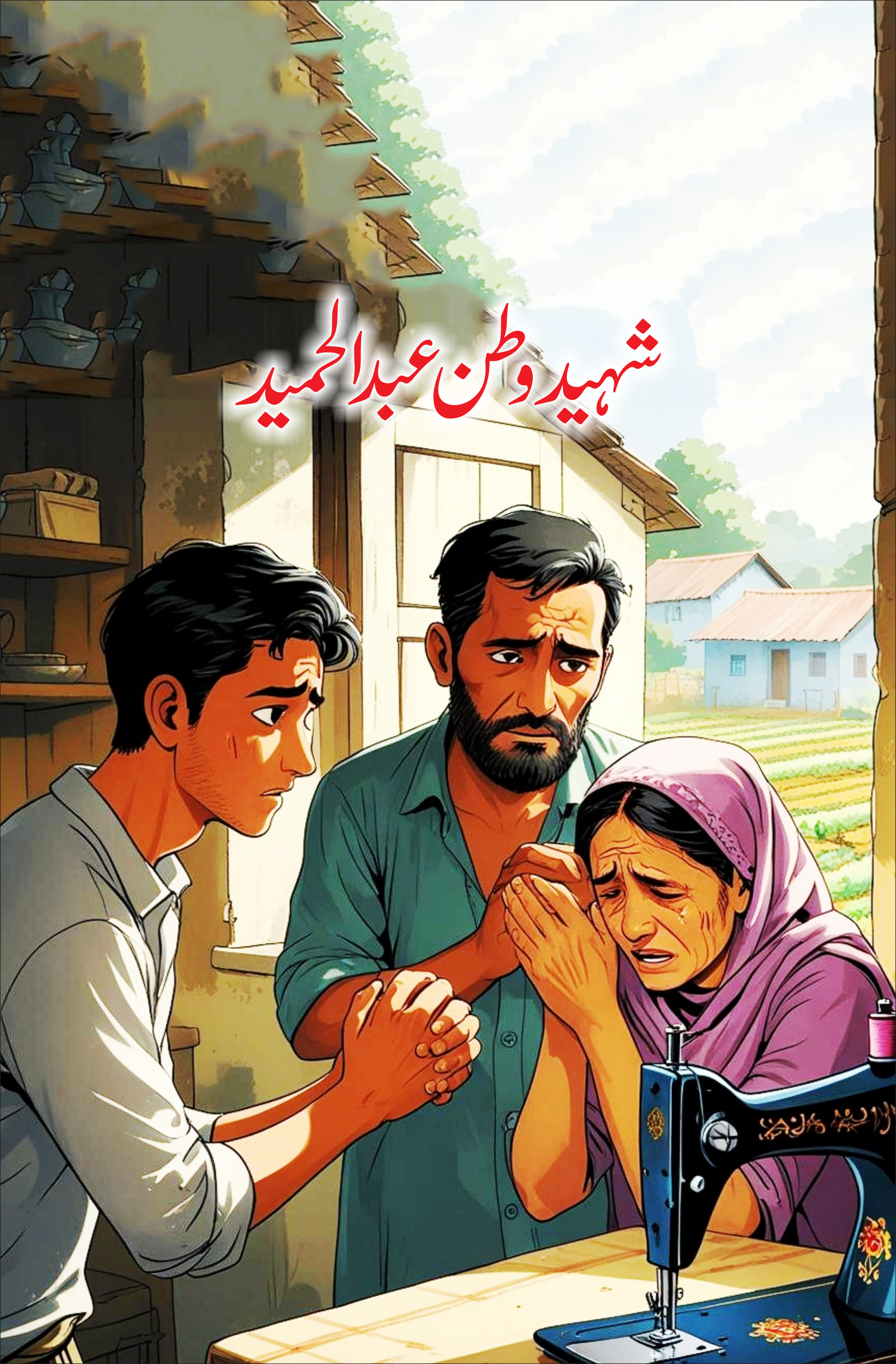

دھامپور کے گاؤں میں ایک چھوٹا سا اسکول تھا۔ وہاں ماسٹر عتیق بچوں کو پڑھائی کے ساتھ حبّ الوطنی کے قصّے بھی سنایا کرتے تھے۔ 1940 کا زمانہ تھا اور ہندوستان پر انگریز راج کر رہے تھے۔ ماسٹر عتیق جب بھی خالی ہوتے تو بچّے ان سے کسی بہادر یا شہید کے بارے میں قصّہ سنانے کو کہتے۔ ماسٹر صاحب بھی کبھی ٹیپو سلطان، کبھی رانی لکشمی بائی اور کبھی 1857 کے شہیدوں کے قصے سناتے۔ کلاس میں مکمل خاموشی چھا جاتی اور بچّے بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سنتے۔

تفریح کے دوران بچوں کا محبوب مشغلہ لڑائی لڑائی ہوتا۔ کوئی ایک بچہ اور اس کے ساتھی مجاہدِ آزادی بنتے اور کچھ بچّے انگریز سپاہی بنتے۔ آج حمیدوا (عبدالحمید) کی ٹیپو سلطان بننے کی باری تھی۔ بچوں نے اپنی تختیوں کو تلوار بنا رکھا تھا تو کچھ بچے اپنے بستے کو ڈھال کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ حمیدوا کا پسندیدا کھیل سپاہی بننا تھا۔ اس کے والد عثمان ایک درزی تھے۔ گھر کے ایک حصے میں ان کی دکان تھی وہیں وہ کپڑے سیتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا بھی خاندانی کام سیکھ کر گھر چلائے۔ وہ دور ہی ایسا تھا۔ عام طور پر لڑکے اپنے آبائی کام کو سیکھتے تھے۔ اور یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ عبدالحمید جب

بیس سال کے ہوئے تو ان کے بچپن کا دوست کلوا فوج میں بھرتی ہو گیا۔ چھٹیوں میں وہ گاؤں آیا تو سب سے پہلے اپنے دوست حمیدوا سے ملنے اس کی دکان پر گیا۔ حمیدوا اس وقت کپڑے سی رہا تھا اور اس کے والد کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ کلوا کو فوج کی وردی میں دیکھ کر حمیدوا حیران رہ گیا۔ فوج کی وردی کلوا پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یہ بات 1953 کی ہے۔ دونوں دوست بچپن کی باتیں کرنے لگے۔ دونوں نے ہی لڑائی لڑائی کھیل کا ذکر کیا اور بہت ہنسے۔

نہ جانے کیوں کلوا سے ملاقات کر کے عبدالحمید کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی فوج میں شامل ہوں۔ ان کا دل بار بار کہتا کہ وہ کسی بڑے کام کو کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

جب عبدالحمید نے اپنے والد سے فوج میں بھرتی ہونے کا ذکر کیا تو انہوں نے صاف منع کر دیا۔ وہ عبدالحمید سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ انہیں اپنی نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ عبدالحمید کی والدہ کو بھی پتہ چلا تو وہ رونے لگیں۔ انہوں نے انہیں بہت سمجھایا کہ حمیدوا ہم تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تم اچھا خاصا سلائی کا کام جانتے ہو۔ اپنا گھر ہے، زمین ہے، گاؤں میں تمہارے دوست ہیں، پھر کیوں ہم سے دور جانا چاہتے ہو۔

والدین نے یہی سوچا کہ عبدالحمید کی شادی کر دی جائے۔ بہو گھر آ جائے گی تو بیٹا فوج میں بھرتی ہونے کا ارادہ ترک کر دے گا۔ انہوں نے گاؤں کی ایک خوب صورت اور نیک لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ عبدالحمید شادی کر کے بہت خوش تھا۔ اس کے باوجود فوج میں بھرتی ہونے کی خواہش ختم نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن وہ گھر والوں کو بتائے بغیر فوج میں بھرتی ہو گیا اور اس کی ٹریننگ شروع ہو گئی۔ وہ ایک وطن پرست اور بہادر سپاہی تھا۔ جلد ہی وہ حولدار کے منصب پر تعینات کر دیا گیا۔

1962ء میں چین نے مادرِ وطن ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ عبدالحمید کی فوجی ٹکڑی کو وطن کا دفاع کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ چین کے پاس بہت بڑی فوج تھی۔ اس کا عبدالحمید اور ان کے ساتھیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن ایک ایک کر کے ان کے ساتھی مادر وطن کے لیے شہید ہوتے گئے۔ عبدالحمید کئی ہفتوں کا سفر کر کے سنگلاخ راستوں سے ہوتے ہوئے ہندوستان کی ایک چوکی تک پہنچے۔ بھوک پیاس اور زخموں سے وہ چور تھے۔ اس کے باوجود ان کے حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ علاج معالجہ کے بعد وہ صحت مند ہو گئے اور کچھ دن چھٹی لے کر گھر آ گئے۔

10 ستمبر 1965 کو پاکستان نے ہندوستان پر امریکی اسلحہ اور حمایت حاصل کر کے حملہ کر دیا۔ یہ اچانک کیا گیا زبردست حملہ تھا۔ وطن کے جیالے نوجوان اپنی زمین کی حفاظت کے لیے فوراً حرکت میں آ گئے۔ اس بار عبدالحمید کی ٹکڑی کو پنجاب کی سرحد پر بھیجا گیا۔ پاکستان کے پاس جدید طرز کے امریکی ساختہ پیٹن ٹینک تھے اور وہ گولہ باری کرتے ہوئے ہندوستان کی سرحد کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جس مقام پر عبدالحمید اپنی ٹکڑی کے ساتھ تعینات تھے وہاں بھاری اسلحہ نہیں تھا۔ ہندوستانی سپاہی، بندوقوں، ہتھ گولوں اور ری کوئیلیس گن سے مقابلہ کر رہے تھے۔ (ریکوئیلیس گن کو جیپ پر نصب کیا جاتا ہے اور اس سے کم دوری پر گولے داغے جاتے ہیں۔)

عبدالحمید نے جب پاکستانی ٹینکوں کو ہندوستان کی جانب بڑھتے دیکھا تو انہوں نے اپنے چار پانچ ساتھیوں کے ساتھ مل کر انہیں روکنے کی کوشش کی اور ریکوئیلیس گن سے ٹینکوں پر نشانہ لگا کر حملہ کرنے لگے۔ ان کا حوصلہ اور جذبہ شہادت دیکھنے لائق تھا۔ انہوں نے حیرت انگیز طور پر سات پاکستانی ٹینک تباہ کر دیے۔ دشمن کا بہت بڑا نقصان تھا۔ یہ بات کسی معجزہ سے کم نہ تھی کہ اتنے مضبوط اور تباہ کن ٹینک کو ریکوئیلیس گن سے تباہ کر دیا گیا۔

ایک ایک کر کے عبدالحمید کے ساتھی شہید ہوتے گئے اور اس بہادر فرزند نے اکیلے ہی پاکستانی ٹینکوں پر بمباری جاری رکھی۔ آخر کار ٹینک سے نکلا ایک گولہ عبدالحمید کی جیپ سے آ ٹکرایا اور مادر ہند کا یہ عظیم سپوت 10 ستمبر 1965ء کو شہید ہو گیا۔ ان کی بہادری نے پاکستانی فوج کی پیش قدمی روک دی اور اسے واپس جانا پڑا۔ ان کی شہادت کے کچھ دن بعد ہی حکومت نے ان کو پرم ویر چکر سے نوازا جو ان کی بیگم رسولن بی نے لیا۔ پنجاب کے چیمہ گاؤں میں شہید کی یادگار قائم کی گئی اور وہاں پاکستان کا ایک تباہ شدہ ٹینک بھی رکھا گیا۔ اس کے علاوہ غازی پور میں بھی شہید وطن عبدالحمید کی یادگار قائم کی گئی۔ عبدالحمید نے اپنی ہمت اور جرأت کے دم پر اپنا نام ہندوستان کے عظیم سپاہیوں میں درج کرا لیا۔

وطن کی خاطر

★

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں نوجوان انقلابیوں کے سرگرم ہونے سے ملک کے نوجوانوں میں نیا جوش بھر گیا تھا۔ چندر شیکھر آزاد، اشفاق اللہ خان، رام پرساد بسمل اور بھگت سنگھ نوجوانوں کے قائدین بن گئے تھے۔ ان نوجوانوں نے انگریزوں کے ہاتھوں قوم پر ہونے والے ظلم اور سختیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اینٹ کا جواب پتّھر سے دینے کا فیصلہ کیا اور سر سے کفن باندھ کر میدان میں اتر آئے۔ نوجوان انقلابیوں نے پشاور سے لے کر بنگال تک انگریز سامراج کی ناک میں دم کر دیا تھا۔

پنجاب میں انقلاب کی آگ بجھانے کے لیے ایک انتہائی ظالم انگریز جیوفرے ڈے کو گورنر بنایا گیا۔ جس نے تحریکِ آزادی کو کچلنے اور مجاہدینِ آزادی کو ختم کرنے کا کام شروع کر دیا۔ پنجاب میں جہاں بھی برطانوی حکومت کے خلاف مظاہرے ہوتے اور جو لوگ ان میں شرکت کرتے انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا۔

بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو جس طرح انگریزوں نے پھانسی دی اس سے پورے ملک میں غم و غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ ایک نوجوان جس کا نام ہری کشن سرحدی تھا وہ ایک ماہر نشانہ باز گوروداس مل کا بیٹا تھا۔ جب یہ 17 سال کا تھا تو اس نے 1925ء میں کاکوری کانڈ

کے بارے میں سنا۔ حالانکہ یہ عمر کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے لیکن ہری کشن سرحدی نے یہی سوچا کہ جب نوجوان لوگ برطانوی حکومت سے ٹکرا سکتے ہیں تو ہم کیوں ایسا نہیں کر سکتے۔ اُس کا خیال تھا کہ ملک کو انگریزوں سے لڑ کر ہی آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اپنی کم عمری کے باوجود وہ انقلابی تنظیم 'نوجوان بھارت سبھا' کا رکن بن گیا۔ اس تنظیم کا کام خفیہ طور پر ایسے نوجوانوں کو اکٹھا کر کے انگریزوں سے مقابلہ کرنا تھا جو برطانوی حکومت سے ٹکرانے کا جذبہ رکھتے تھے۔ ہری کشن سرحدی اور ان کے ساتھیوں کو بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت پر بڑا غصّہ تھا اور ان کے دلوں میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔

ہری کشن نے کسی طرح پیسے جمع کر کے ایک ریوالور اور گولیاں خریدیں اور اپنے والد سے نشانہ بازی کی تربیت حاصل کی۔ ان کے والد نے کچھ ہی دنوں میں انہیں اچھا نشانہ باز بنا دیا۔ انہوں نے اپنے والد گورو داس مل کو بتا دیا کہ وہ کس لیے نشانہ بازی سیکھ رہے ہیں۔

23 دسمبر 1930ء کو پنجاب یونیورسٹی میں تکمیل تعلیم کی تقریب (کنووکیشن) تھا جس میں گورنر جیوفرے ڈے بطور مہمان خصوصی شرکت کرنے والا تھا۔ لہٰذا انقلابی نوجوانوں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور اسے قتل کرنے کا پلان بنایا۔ اس کام کے لیے نوجوان ہری کشن سرحدی نے خود کو پیش کیا۔ انہوں نے یونیورسٹی طالب علم جیسا بھیس بنایا اور ایک ڈکشنری کو اندر سے کاٹ کر اس میں پستول رکھ لی۔ جس جگہ تقریب تھی وہاں چاروں طرف سخت سیکورٹی تھی لیکن انہوں نے کسی کو شک بھی نہیں ہونے دیا اور وہ کنووکیشن ہال میں داخل ہو گئے اور تقریب ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جب تقریب ختم ہوئی اور گورنر چلنے کے لیے اٹھا تو انہوں نے آگے بڑھ کر پستول نکال لی اور ایک کرسی پر چڑھ کر اس پر فائر کر دیا۔ پہلی گولی گورنر کے بازو میں پیوست ہو گئی اور دوسری اس کی کمر کو چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ ہال میں افراتفری کا ماحول تھا۔ سب اپنی اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے

تھے۔اس پروگرام میں ڈاکٹر رادھا کرشنن بھی آئے ہوئے تھے۔وہ گورنر جیوفرے ڈے کو بچانے اس کے سامنے آ گئے۔ ہری کشن نے ان پر گولی نہیں چلائی۔وہ برابر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ ہری کشن ہال سے باہر کی جانب دوڑے اور جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں اس طرف بڑھے تبھی داروغہ چانن سنگھ نے انہیں پیچھے سے آ کر دبوچ لیا لیکن انہوں نے خود کو چھڑا لیا اور اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔سامنے سے ایک اور سپاہی بدھ سنگھ آیا اور اس نے ان پر حملہ کیا لیکن وہ خود کو بچانے میں کامیاب ہو گئے اور ایک گاڑی کے پیچھے جا کر اپنی ریوالور میں گولیاں بھرنے لگے۔وہاں کئی پولیس والے پہنچ گئے اور انہیں گھیر کر ریوالور چھین لی۔انہیں گرفتار کر کے لاہور جیل میں ڈال دیا گیا جو اس زمانے میں سب سے زیادہ خطرناک جیل مانی جاتی تھی اور وہاں مجاہدین آزادی کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

ہری کشن سرحدی کو وہاں بری طرح ٹارچر کیا گیا۔سخت ٹھنڈ میں انہیں برف کی سلّیوں پر لٹایا گیا اور اس سازش میں شریک دیگر انقلابیوں کے بارے میں پوچھا گیا۔وہ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے رہے۔

26 جنوری 1931ء کو عدالت نے انہیں سزائے موت سنائی۔جب وہ لاہور کی میاں والی جیل میں بند تھے تو ان کی دادی ان سے ملنے آئیں۔انہوں نے پوتے سے کہا ''بیٹا پوری شان سے پھانسی کے تختے پر چڑھنا۔یہی انقلابیوں کی شادی ہوتی ہے۔'' سرحدی نے مسکراتے ہوئے کہا ''دادی میں شیرنی کا پوتا ہوں۔وطن کی خاطر ہنستے ہوئے جان دوں گا۔''

انہوں نے اپنے والد کو بتایا کہ جب میں نے جیوفرے ڈے کو نشانہ پر لیا تو کرسی ہل گئی تھی اس لیے نشانہ چوک گیا۔

9 جون 1931ء کی صبح 6 بجے لاہور کی میاں والی جیل میں اس انقلابی نے غسل کیا،

پھانسی کا لباس پہنا اور'انقلاب زندہ باد' کے نعرے لگا تا ہوا پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا۔ جلّاد نے آخری خواہش پوچھی تو انہوں نے کہا"میری لاش میرے خاندان والوں کے سپرد کردی جائے۔" اس کے بعد وہ پھانسی کے پھندے پر جھول گئے۔ لیکن انگریزوں نے ان کی لاش ان کے گھر والوں کو دینے سے انکار کردیا اور اسے جیل میں ہی جلا دیا۔

ان کے والد گوروداس مل کو بھی گرفتار کرلیا گیا اور جیل میں انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جیل کی سختیوں اور تشدد کے باعث وہ بھی کچھ ماہ بعد جیل میں ہی شہید ہو گئے۔

اس طرح باپ بیٹے نے وطن کی خاطر اپنی جانیں قربان کردیں۔

خسرو فاؤنڈیشن - ایک نئی پہل

ہندوستان، جنت نشان جو مذہبی، لسانی اور تہذیبی تکثیریت کا ملک ہے، کثرت میں وحدت سے جس کی پہچان ہوتی ہے، اس عظیم ملک کی تاریخ کا ہر دور انسان دوستی کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے، جس میں شکتی اور شانتی بھکتوں کے گیتوں کا نتیجہ ہے، ہندوستان ہمیشہ اس بات کا گواہ رہا ہے کہ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۔

پتہ نہیں کہ دنیا کو کس کی نظر لگ گئی کہ سماجی قربتیں فاصلوں میں بدلنے لگیں ہیں۔ اس دیس کے باسیوں کی بڑی تعداد اگرچہ آج بھی اس عدم اتفاق اور تفریق کا حصہ بننے کو تیار نہیں لیکن غالب ترین اکثریت بھی اگر خاموش رہے تو وہ اس کے وجود کو عدم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اب زیادہ تر لوگ اپنی ذات کے گرد طواف کر رہے ہیں۔ غم زمانہ کی جگہ دردِ تنہا سے دو چار ہیں اور وہ انسان جو کبھی ضمیرِ دشت و دریا تھا آج اسیرِ آشیانہ بنا ہوا ہے۔ ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا جا سکتا، اس لئے ضروری ہے کہ ایک بار پھر ان تمام علامتوں کو زندہ کیا جائے جو ''محبتوں کی گاتھا'' اور ''پریم کے ڈھائی اکچھر'' سے لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رہیں جن کے نزدیک مادرِ وطن، وہاں پیدا ہونے اور بسنے والے، اس کے دریاؤں کا پانی پینے والے، اس کے کھیتوں میں پیدا ہونے والے

رزق سے اپنی بھوک مٹانے والوں کو پھر اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ان کا مذہب، زبان اور علاقہ کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن ماں اور ماٹی سے ان کا رشتہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے اور چلانے والے رب کی مرضی کا نتیجہ ہے اور جس میں رب راضی اس میں سب راضی رہیں، تو ہی بہتری اور بھلائی ہے۔

ہندوستان میں ایک دوسرے کو جوڑنے والوں کا اگر ذکر کیا جائے تو ان کے نام اور کام گنانے میں کوئی دیر نہ لگے گی لیکن اگر ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والوں اور بانٹنے والوں کے نام کسی سے پوچھے جائیں تو اسے ان کے نام یاد کرنے اور بتانے میں بڑی مشکل آئے گی۔ اس سب کے باوجود آج پھر یہ دوریاں اور یہ ٹکراؤ جو گاہے بگاہے دیکھنے کو ملتا ہے اس کا سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ ہم نے انہیں بھلا دیا ہے جنہیں ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ دیوی دیوتاؤں، پیغمبروں، پیروں اور رشیوں مُنیوں کے تیاگ، تپسّیا، سمرپن اور سیوا بھاؤ کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے سندیش اور اپدیش ایک دفعہ پھر لوگوں تک پہنچائے جائیں۔

یہی وہ سوچ اور فکر مندی ہے جس کے تحت ''خسرو فاؤنڈیشن'' کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ حضرت امیر خسرو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی وہ محبوب، دلنواز اور ہمہ گیر شخصیت ہیں جنہیں صدیاں گزر جانے کے باوجود یاد رکھا گیا اور ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ بیک وقت صوفی بھی تھے اور سپاہی بھی، وہ شاعر بھی تھے اور ماہرِ موسیقی بھی، وہ مورخ بھی تھے اور تاریخ ساز بھی۔ غرض ان کی شخصیت کی عبقریت نے ان کو گوں نا گوں صفات کا حامل اور ہمہ جہت پہلوؤں سے اس طرح متصف کیا کہ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں بڑے بڑے نامیوں کے نشان مٹ گئے لیکن جب سے آج تک نہ صرف خسرو بلکہ ہماری تاریخ کا ہر جز انسانی ذہنوں میں زندہ و تابندہ ہے۔ مسرت کے لمحے ہوں یا یاس و غم کی گھڑیاں، خسرو کا

نام اور کلام ہمہ وقت اپنی جاذبیت اور آفاقیت کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے۔

اس گتھی کو تو ماہرینِ نفسیات ہی سلجھا سکتے ہیں کہ خسرو نے کس طرح حال وقال، جنگ وجدل، سوز و ساز، خانقاہ اور دربار کے درمیان توازن برقرار رکھا۔ یہ اس لیے بھی اہم ہیں کہ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے یہ توازن اپنی شخصیت کے کھرے پن کے ساتھ قائم کیا تھا۔ ان کی ہر وابستگی اور ہر رول کھلی کتاب کی طرح سب پر عیاں تھا اور اس کھلے پن کے تعلقات کے باوجود زندگی بھر کامیاب رہے۔ صدق بہ تدبّر کی مثالیں امیر خسرو کی شخصیت کو ہمارے لئے اور بھی آئیڈیل بناتی ہیں۔

اس ''ترک نژاد'' کی وطن دوستی نہ صرف مثالی، بلکہ قابلِ رشک بھی ہے۔ خسرو کے نزدیک یہ سرزمینِ ہند، عدن کی جنت، یہاں کے لوگ ہر رنگ میں انہیں عزیز، یہاں کے درباروں کے آگے ایران، توران، خراسان کے دربار ہیچ۔ یہاں کے لوگ ہر صنعت، علم وادب کی ہر شاخ، فنونِ لطیفہ کے ہر میدان اور عسکری تربیت کے ہر انداز میں ''بے نظیر'' اہلِ ہند کا توحیدی مسلک انہیں باوجود ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے عزیز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ وہ (یعنی اہلِ ہند) ہمارے جیسا دین نہیں رکھتے، مگر ان کے اکثر عقیدے ہمارے جیسے ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہندوستان، ہندوستان کی ہر روایت چاہے وہ مذہبی ہو یا تہذیبی، ثقافتی ہو یا لسانی، علمی ہو یا ادبی، اس کو خسرو کی طرح دیکھیں، اپنائیں، اس پر صدقے اور واری جائیں۔ خسرو جن کی ماں ہندی اور باپ ترک تھے، ایسے ہندوستانی ہیں جو ہندوستان کی عظمت کے ترانے ہی نہیں گاتے بلکہ وہ اپنے آپ کو اس مٹی کا اس طرح حصہ بنانا چاہتے ہیں جیسے یہ مٹی ہی سب کچھ ہو اور جس سے تعلق اور محبت کو الطاف حسین حالی نے یوں بیان کیا ہے:

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

خسرو فاؤنڈیشن وطن دوستی، انسان دوستی، فطرت سے ہم آہنگی، ہر طرح کی تفریق چاہے وہ فرقہ وارانہ ہو یا جنسی سب سے اوپر اٹھ کر محبت کو عام کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے کہ بقول شیخ ابراہیم ذوق:

گلہائے رنگارنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

Tiranga Aanchal

Taha Nasim

بچوں کے لئے لکھنا آسان نہیں۔ اس کے لئے بچوں کی نفسیات اور آسان زبان سے گہری واقفیت ہونا بے حد ضروری ہے۔ طہٰ نسیم گزشتہ 27 سالوں سے بچوں کے لئے لکھ رہے ہیں۔ ان کا تعلق دہلی کے ایک علمی گھرانے سے ہے۔ انہوں نے بچوں میں تاریخ کی سمجھ اور سائنسی فکر پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بالخصوص سائنس اور جغرافیہ پر باتصویر کتابیں شائع کی ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے پانچ کتابوں پر مشتمل چن من سیریز بھی لکھی ہے۔

حالانکہ انہوں نے پہلا افسانہ 1992 میں ''مستقبل'' کے عنوان سے لکھا جو دہشت گردی کا شکار ہونے والے معصوم شہریوں کی ہلاکت کے خلاف احتجاج تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اردو اور ہندی میں کئی کہانیاں لکھیں۔ بچوں کے لئے ان کی پہلی کہانی ہندی ماہنامہ نندن میں شائع ہوئی اور ایک سائنسی سیریز ماہنامہ ''پر دنّیا'' میں کافی عرصہ چلی۔ اردو میں ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''برف کا سپاہی'' آیا۔ اسی کے ساتھ افسانوں کا مجموعہ ''امید کا ٹکٹ'' بھی۔ انہوں نے بچوں کے لئے پہلی معلومات عامہ کی کتاب ''بسمہ جنرل نالج'' لکھی۔

طہٰ نسیم نے سائنس پر ایک فکشن ''دنیا خطرے میں'' اور 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ایک گمنام مجاہدہ پر لکھا۔ وہ بچوں اور بڑوں کے لئے مزاحیہ مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ طنز و مزاح پر ان کے دو مجموعے ''ہنستے ہنستے جینا سیکھو'' اور ''ایوارڈ برائے فروخت'' بھی مقبول عام ہو چکے ہیں۔ ثانی الذکر کو دہلی اردو اکادمی سے ایوارڈ بھی ملا ہے۔ طہٰ نسیم نے ادب اطفال، تاریخ اور اردو ادب پر ستر سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے مضامین اور کہانیاں اخبارات اور جرائد میں مستقل شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انہیں دہلی، اتر پردیش اور بنگال اردو اکادمیوں کے علاوہ حکومتِ دہلی سے بھی ایوارڈز ملے ہیں۔ ان کی اس کتاب ''ترنگا آنچل'' میں حب الوطنی اور فرقہ وارانہ اتحاد و یکجہتی پر کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کی بھی دلچسپی کے لئے ہیں۔

ISBN:978-81-989382-7-5

9 788198 938275

खुसरो फ़ाउण्डेशन خسرو فاؤنڈیشن

KHUSRO FOUNDATION

D-319, Defence Colony, New Delhi-110024 +91 9318431341

@Khusrofounda @khusrofoundation @foundationkhusro @khusro_foundation

Rs. 150.00